تم کون ہو؟

مصنفہ

آمنہ ابوالحسن

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد ۲

قیمت : چھ روپے

بار اوّل : ۱۹۷۴ء

کتابت
شاگرد سلام عبدالکلیم

مطبوعہ
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان حیدرآباد

فون : ۴۲۷۰۴

آمنہ ابو الحسن :

عکس و آہنگ!

لوگ کہتے ہیں لکھنا بہت مشکل ہے اور بولنا بہت آسان۔ لیکن میرے لئے لکھنا بہت آسان ہے۔ بولتے رہنا ذرا مشکل۔ بولتے وقت الفاظ اکثر میرے ذہن اور دہن سے غائب ہو جاتے ہیں مگر لکھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اندر کوئی دفینہ ہے جو ہمیشہ اپنا منہ پوری فراخ دلی سے کھول دیتا ہے کہ لو جتنا چاہو لے لو، بے دریغ خرچ کر لو، میں کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ میں تمہارا منبع ہوں۔ تمہاری شخصیت کا سرچشمہ، تمہارے محسوسات کا خزانہ اور پھر جمیل کیفیات اور شکیل الفاظ میرے اندرونی سے ترشے ترشے کر اُبھرنے لگتے ہیں۔ میرے اظہار کی اوک لبالب لبریز ہو جاتی ہے۔ تب عجیب فخر و غرور، طاقت و عزم محسوس ہوتا ہے اور ٹھیک ایسے ہی لمحوں میں مجھے حیات اور کائنات اشد ضروری محسوس ہوتے ہیں جیسے میں کبھی حیات اور کائنات سے بچھڑ نہیں سکتی۔ الگ اور جدا نہیں رہ سکتی جیسے میں خود ان کے جسم و جاں میں گھلی ملی صدیوں زندہ اور باحیات رہوں گی۔ اس حساس جذبے کی طرح جس کی دنیا کو ازل سے ابد تک ضرورت ہوا کرتی ہے۔ دنیا جو ہر ایک کو بھولی

جانے میں ماہر ہوتی ہے۔ ایسے جذبوں سے پھر بھی منحرف اور منکر نہیں ہو سکتی۔ ایسے جذبوں کے بغیر سانس نہیں لے سکتی۔

مجھے خطرات سے کھیلنے کا شوق ہے۔ سمندر، سانپ، شیر اور گھوڑا بہت پسند ہیں۔ ہمارے بہت سارے شوق تھے لیکن اب گنے چنے رہ گئے ہیں۔

میرا دل ایک گلستاں ہے جہاں پھل پھول اور سایہ دار درختوں کے ساتھ ساتھ چند کیکٹس بھی اُگے ہوئے ہیں۔

خلوص میری کمزوری ہے۔ میں چہرے کبھی نہیں بھولتی لیکن نام اکثر بھول جاتی ہوں۔

مجھے دنیا پسند ہے کیونکہ دنیا مجھے ہمیشہ ایک ضخیم اور قابل توجہ کتاب کی طرح نظر آئی جس کے اسلوب سے مرعوب و متاثر میں زیادہ تر اسی کتاب کو پڑھتی رہی ہوں اور بے حد حفاظت کی خاطر میں نے یہ کتاب کبھی اپنے کسی کتابوں والے شیلف میں نہیں رکھی بلکہ ہمیشہ اِسے اپنے ذہن کے محفوظ ترین شیلف میں ہی رکھا کرتی ہوں۔ اپنے شوق سے مجبور میں نے اس کتاب کو بے حد دلچسپی اور انہماک سے پڑھا ہے۔ اس قدر نگاہ جما کے کہ اس کی حد سے زیادہ ضخامت، تنوع اور تضاد کے باوجود اس کا ایک ایک نقطہ اور شوشہ تک میرے ذہن کی آنکھوں میں جم کر رہ گیا ہے۔ جس کی گوناگونی اور بوقلمونی نے خود مجھ میں لکھنے کی تحریک پیدا کی ہے کیونکہ وہ سارے کردار اور موضوع جو پہلے تو میری نظر سے گزرے پھر ذہن سے تب کہیں میرے قلم سے گزر پائے دراصل اسی لاجواب کتاب کے بخشے ہوئے ہیں۔ ایک منظم مربوط سلسلے کی طرح۔ اسی لئے شاید میری تحریر خود میری شخصیت ہے اور میری شخصیت خود ایک تحریر۔ اور یہ بھی کوئی شاعرانہ غلو یا مصورانہ رنگ آمیزی نہیں کہ رنگ اور گیت کا مجھ پر بڑا گہرا اثر رہا ہے۔ میں جب تک چہچہاتے، مسکراتے رنگ نہیں دیکھ لیتی میرا احساس سنورتا نہیں۔ حالانکہ آج کے عہد میں گیت اور رنگ کے سہارے زندہ رہنا بڑا مضحکہ خیز معلوم

ہوتا ہے کہ آج کے مسائل زیادہ سنگین، تقاضے زیادہ شدید، قدریں بے حد جُدا گانہ ہو چکی ہیں۔ نزاکتیں بے مقام ہو گئی ہیں۔ آج کے انسان کے لئے یہ بہت اہم ہے کہ وہ داخلی اور خارجی افراتفری کے چوکھٹے میں خود کو کسی طرح فِٹ کرے۔ خواہشِ حیات کے ساتھ ساتھ موت سے بھی ہر آن کھیلے۔ ہر سطح پر مرے اور پھر جیئے۔ بلکہ زندگی کو محض موت کے نذرانے کے طور پر ساتھ ساتھ لئے پھرے مگر ایسے میں بھی میرا ذہن رہ رہ کے اُنہی باتوں کی طرف چلا جاتا ہے، اُنہی پر زیادہ مرکوز رہتا ہے جو دائمی اور ابدی قدروں کی طرح ناقابلِ لوٹ کھسوٹ ہیں۔ جن کے چہرے مسخ ہو کر بھی اپنے اصلی خدوخال اُجاگر کرنے سے نہیں چوکتے۔ جو چُپکے چُپکے مجھ سے کہتے رہتے ہیں کہ اس ہر ہر طرح کی ارزانی اور انتشار کے دَور میں بھی کچھ مسحور کن چیزیں ایسی ضرور باقی ہیں جو زخمی سے زخمی انسان، آلودہ سے آلودہ ذہن، ناآسودہ سے ناآسودہ خیال کو بھی راحت و سکون عطا کر سکتی ہیں۔ ہر زخم کے لئے پھایا بن سکتی ہیں۔ ہر آلودگی کو دھو سکتی ہیں۔ ہر ناآسودگی کو آسودہ اور مطمئن کرنے کی سکت اور صلاحیت خود میں رکھتی ہیں۔ جو سارے مسائل، تقاضوں اور اختلافات کو اپنی اوٹ میں ڈھک سکتی ہیں۔ جو اس بے سروسامانی میں بھی انسان کو ہر ہر تفرقے کو بھول کر انسان بننے پر مجبور کر سکتی ہیں۔ اور عقائد کے جنون، نفاق کی نفرت، غارت گری کی دہشت، قتل کی خوفناکی، اقتدار کی ہوس، قانون کی بندش، مذہب کے تصوّر سے ماوراء ہو کر اُس انسانیت کو محسوس کرانے کی اہل ہیں جس کی اساس محبت اور خلوص کی عالمگیر بنیادوں پر رکھی گئی ہے۔ جو انسان کو مغلوب و متنفر کرنا نہیں سکھاتی۔ جو سفاکی سے عبارت نہیں۔ میں اُس انسان کی قدر و منزلت نہیں کر سکتی جو جذبۂ محبت سے محروم ہو۔ جو زندگی کو ایک سوغات نہ سمجھتا ہو۔ جو دکھ، درد، چیخ اور آنسو سے بے پرواہ ہو۔ جو مرنے مارنے، لُٹنے لوٹنے، کٹنے کاٹنے اور تڑپتی ہوئی زندگیوں کی کراہوں سے محظوظ ہونے کی بہیمیت میں

مبتلا ہوں مگر جب میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ میں دن بدن ایسے ہی خونیں دائروں میں قید، ایسے ہی بے رحم زندانوں میں اسیر، ایسی ہی قاتل حصاروں میں محبوس ہوتی جارہی ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ اور بھی اونچے سُروں میں گیت گاؤں۔ اور بھی رنگ و نور کی برساتیں برساوں۔ اور بھی قہقہے لگاؤں۔ اور بھی جی بھر کر پیار کروں، پیار دوں، پیار سمیٹوں۔ اور بھی نازک احساس کے گلے لگ جاؤں تاکہ پھر یہ حسرت نہ رہ جائے کہ میں نے بھی اس دنیا میں کچھ نہیں کیا۔ میری بھی آواز، میرا بھی احساس، میرے بھی ارمان، میری کُل حیات محض بے حسی، بے دردی اور بد ذوقی کی نذر ہوگئی۔

آپ چاہیں تو بے شک میری اس دیوانگی، میرے جنونِ حیات، میرے حوصلہ دار ارمان کا مضحکہ اڑالیں مگر میں خون کا سیلاب نہیں دیکھ سکتی۔ کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں، سر دھڑ، منتشر اعضاء نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں مسخ ذہن اور شکلیں برداشت نہیں کرسکتی کہ مجھے نفاست، لطافت، بھولپن، بانکپن، خلوص اور خوشبو سے خوبصورتی اور قرینے سے پیار ہے میں زندگی سے اندھا دھند رویے کی قائل نہیں۔ مجھے ہتھیار پسند نہیں، وہ خیالات، وہ منصوبے اور عمل پسند نہیں جو زندگی کو سازش کا شکار کریں۔ جو احساسات اور نسلوں کے سر قلم کر ڈالیں۔ میں چاہتی ہوں موت کے حضور میں کچھ بھی ملوث نہ پہونچوں بلکہ ثابت و سالم، آن بان سے پہنچوں اور تب اگر کوئی مجھ سے یہ سوال کرے کہ اپنے کارنامے بتاؤ تو بجا طور پر کہہ سکوں کہ میں نے ہر اچھے جذبے کی پرورش و پرداخت کی ہے۔ میں نے اُس مجنوں کی طرح زندگی گزارنے کی کوشش کی ہے جس نے لاتعداد پتھر کھائے، مگر اپنے ہی جذبے میں غلطاں رہا۔

اور جب میں اس طرح سوچتی ہوں تو مجھے حالیہ عہد کی ساری سفاکی، خود غرضی، خوفناکی، تضاد، تصادم اور انتشار کے باوجود قرار آجاتا ہے۔ میری ذات

میں ایک سکون سا پھیل جاتا ہے۔ گیت گونجنے اور رنگ مسکرانے لگتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ گیت کائنات کی آواز ہے۔ اور رنگ کائنات کا احساس ـــ پتے پتے، بوٹے بوٹے، شگوفے شگوفے میں نہاں۔ زیست کی ذی شان صراحی میں پڑا ہر دم چھلکتا، جھومتا اور کہتا ہوا کہ او دیوانو! او متوالو! او شوقینو آؤ اور مجھے سمیٹ لو۔ اپنے ساغرِ چشم میں محفوظ کر لو! اپنے کٹورۂ ذہن میں آمیز کر لو۔ اپنے سبوئے رُخسار میں سمالو، اپنے پیالۂ دل میں بھر لو! اپنے مینائے جسم میں گھول لو کہ میں زمین سے آسمان تک موجود ہوں۔ میں نے ہی تمہیں حسین نام، چنچل اور پُرتپاک عنوان دیئے ہیں۔ میں ہر شئے، ہر سوچ، ہر فکر میں موجود ہوں۔

تبھی تو رنگوں کے بغیر جینا کم از کم میرے لئے ممکن نہیں اور اسی لئے رنگ میرے تمام افکارات کا سب سے نمایاں اور حقیقی حصّہ رہے ہیں اور جہاں جہاں رنگ نہیں وہاں وہاں کائنات مجھے ایک فریب اور دھوکا نظر آتی ہے ـــ

رنگ خواہ کیسا ہی سہی، ہلکا پھیکا، شوخ شریر، آسمانی آفاقی، معصوم مفکر ہمیشہ ہر حالت میں میری توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اپنے اثر اور ادراک کے ساتھ مجھے بہرحال محبوب غرض کہ بے رنگی کی دشمن ہوں اور زندگی کی وضاحت کے لئے رنگ کی موجودگی، رنگ کا اہتمام، رنگ کا امتزاج ضروری متصوّر کرتی ہوں ـ

اور یہ میری عین تمنّا ہے کہ میری نظر، میرے ذہن، میرے وجود کا خاتمہ بھی ہرگز کسی بے رنگی پر نہ ہو کہ جب اس دیارِ فانی سے گزروں، دیارِ عقل سے کوچ کروں، دیارِ دل سے بچھڑوں تو وہ سرخ ملبوس ہی میرا کفن بنے جو میرے سہاگ کا سکھ بھی ہے اور رنگ سے زندگی بھر میری دیوانہ وار اور پیہم محبت کا غماز بھی ـ

ہنسیے نہیں یا ہنس لیجئے لیکن جو چشموں کے اُبلنے کی نرم آواز سُن سکتے ہیں۔ جھرنوں کے جاگنے کی دھیمی رفتار محسوس کر سکتے ہیں۔ مواج سمندروں کا حشر ساماں تلاطم

نظر بھر کر دیکھ سکتے ہیں۔ جو صحراؤں کے وجیہہ سناٹوں کو جان پہچان سکتے ہیں اور
جو اسرارِ حیات کی پیچیدہ اُلجھنوں اور قبرستان کے بھیانک و دلخراش سکوتِ
بہیم کو بغیر خوفزدہ ہوئے برداشت کر سکتے ہیں صرف وہی یہ بھی بخوبی جان سکتے ہیں کہ
ایک حساس عورت اپنی خواہش میں کتنی بے پناہ اور غیر معمولی ہوتی ہے۔ ہر دکھ اور
سُکھ میں خود اپنی معاون و مددگار کہ وہ عورت جو محبت کرنا جانتی ہے اپنے جسم،
اپنے ذہن، اپنی مسرت اپنے خوف، اپنی رسائی یا نارسائی، آسودگی یا ناآسودگی۔
اپنے اجتناب یا سپُردگی، اپنی جارحیت اور مدافعت اپنی کُل شخصیت میں ہمیشہ با اعتقاد
بلند خیال، طاقت و قوت کا مظہر ہوتی ہے اور یہ گمان نہیں یقین ہے میرا کہ اگر دنیا میں
موسیقی نہ ہوتی تو شاید میں خود بھی نہ ہوتی۔ اگر بھولے چوکے یا اشد ضروری طور پر
پیدا بھی ہو جاتی تو پھر دیر تک زندہ نہ رہ پاتی شاید فوراً مر جاتی کہ جس طرح خوب
صورت رنگ دیکھ کر میرے محسوسات کے چشمے اُبلنے لگتے ہیں بالکل اُسی طرح جب
بھی اچھی موسیقی میرے کانوں سے گزرتی ہے تو احساسات کا ہر ہر بند دریچہ ٹھنک
میرے وجود میں کھُل جاتا ہے اور پھر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے ساری دُنیا کے
دل یکجا ہو کر فقط میرے کانوں میں دھڑکنے لگے ہیں۔ تمام ریشمی جذبے میری ذات
سے گزرنے لگے ہیں۔ متنوع اور لطیف کیفیات میرا سرمایۂ جان بن گئی ہیں۔

جیسے کوئی جوانی یکایک اپنے مفہوم سے آگاہ ہو گئی ہے کسی بچّے نے کہیں جنم
لیا ہے، کسی مخمور شباب نے انگڑائی توڑی ہے یا کسی چنچل نے اپنا نام بتا دیا ہے۔ کسی
اصرار نے اپنا اتا پتہ، کسی قدم نے اپنا نشان، کسی چشمے نے کہیں قلقل کی ہے۔ کوئی پائل
بج اٹھی ہے۔ کوئی فنکار مُسکرایا ہے، کسی تخلیق نے اپنا مقام پا یا ہے، گھنگھرو بولے
ہیں۔ بادل جھومے ہیں۔ جیسے کوئی نہا کر آیا ہے۔ نرم نرم، اچھوتی اچھوتی، گلابی گلابی

کیفیت

کسی مور نے رقص شروع کیا ہے کوئی ہرن کلیل بھر چلا ہے، آبی پرندوں کی ڈار لامتناہی پنہائیوں میں کہیں گم ہونے لگی ہے جیسے امرائی پر بہار آئی ہے۔ کوئل کوکنے پپیہا پی پی کرنے لگا ہے۔ کنواریوں کو جلو میں لئے متوالے جھولے بڑھ بڑھ کر پینگیں لی ہیں۔ کسی نے ملہار گایا ہے، کسی پتھر سے اچانک کوئی جھرنا پھوٹ بہا ہے۔ کسی سیپ نے کوئی موتی اگل دیا ہے، سینۂ زمین پر کوئی فصل لہلہا اٹھی ہے۔ نئی نئی مبہوت کونپلوں میں جان پڑ گئی ہے۔ بھری بھری بالیوں میں اناج کے روپہلی سنہری دانے پنپ گئے ہیں۔ جیسے دُور تا حد نظر تک ہری ہری دوب لہراتی چلی گئی ہے۔ کوئی ناگن جو بل کھاتی دوڑی چلی جا رہی ہے یا کوئی وشال شانت سمندر جو سینۂ گیتی پر خاموش پڑا مستا رہا ہے۔ کسی گڈریے نے اپنی بانسری بجائی ہے۔ کسی کسان نے کام ختم کر کے کمبل اپنے شانوں پر ڈال لیا ہے۔ کوئی شیرخوار اپنی ماں کی آغوش میں مسکرایا ہے یا کسی سنگتراش نے کوئی جمیل پتھر تراش ڈالا ہے۔ کوئی محبوب دزدیدہ نگاہی سے اپنے معشوق کو تک رہا ہے یا کوئی ماں نگاہِ گداز اور آرزوے لازوال سے اپنے لال کو دیکھے جا رہی ہے۔ جیسے بحر عمیق میں کوئی مشاق ملاح اپنی ناؤ طمانیت اور بے خوفی سے کھینے لگا ہے۔ کوئی مانجھی ماہیا الاپنے لگا ہے۔ کوئی لبالب گاگر چھلک پڑی ہے۔ کوئی بے تاب پیاسا اوک سے جلد جلد پانی پی رہا ہے۔ کسی کے دل میں خواہش کا کوئی چاند چمکا ہے۔ راز کی انوکھی بات سُن کر کسی کے وجود پر گہرا رنگ دوڑ گیا ہے۔

کسی نے بربط اٹھا لیا ہے۔

یا جیسے تنگ آبنائے میں پانی تھم تھم کر، رُک رُک کر بہہ رہا ہے۔ کوئی اپنے گیسو سمیٹنے سنوارنے لگا ہے۔

دو متوالے پنچھی اڑتے ہوئے دُور نکل گئے ہیں۔

دو نوعمر سکھیاں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگی ہیں یا زیرِ زمیں کہنہ جڑوں نے اطمینان اور بے خوفی سے اپنے پاؤں پھیلا رکھے ہیں۔

کوئی مالن پھول چن چن کر اپنی ٹوکری میں رکھ رہی ہے۔ یا کوئی دھوبن سُتھرے کپڑے چھانٹ چھانٹ کر الگ بٹور رہی ہے۔

کوئی پیڑ ابنوں میں سانپ ڈھونڈنے نکل گیا ہے، یا کوئی بے فکرا کہیں غوطے لگا رہا ہے۔ جیسے اوس کا قطرہ ٹھیک پھول کے دل میں آجما ہے۔ یا کسی اچھی چیز کو دیکھ کر نظر خود بخود خیرہ ہو گئی ہے۔ کوئی بے ساختہ ہنس پڑا ہے۔

کسی نے چشمِ شوق وا کر دی باہیں پھیلا دی ہیں۔

کسی دیوار پر دھوپ لپک لپک کر چڑھنے لگی ہے یا خاموش آنگن میں پتّے کھڑکنے لگے ہیں۔

کسی بچھڑے کا خط دُور دراز سے آگیا ہے اور کسی پژمردہ دل میں کوئی نیا ارمان جاگ گیا ہے۔ خوشبو کے پیام سے کوئی کلی تھرتھرائی ہے۔ یا کسی جوگن نے اپنا ایکتارہ اُٹھایا ہے۔

مشتاق انگلیوں نے کینوس پر رنگ بکھیر دیے ہیں یا کسی منچلے نے رختِ سفر باندھا ہے۔ کوئی گھنے گھنے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرنے لگا ہے یا خانۂ جسم میں چپکے سے جرعۂ جاں انڈیلنے لگا ہے۔

ہونٹوں پر ہونٹ شہد کی طرح جم گئے ہیں۔ شوخ شریر اُجالے ہر سمت پھیل گئے ہیں۔ خوش آیند تمنّاؤں نے رخساروں پر اپنا دمکتا غازہ مل دیا ہے۔

خوابیدہ آنکھوں میں ملن کے خواب گھلنے لگے ہیں۔

شوق کے اُمید افزا جسم میں خواہشِ وصال کا بے پایاں ہجوم ٹھاٹھیں مارنے لگا ہے۔

کسی مطرب نے ساز پر انگلیاں رکھ دی ہیں یا کسی فانوس میں کوئی شمع جل اٹھی ہے کسی پنجرے میں قید کوئی پنچھی اپنا تن من کھونے لگا ہے یا کوئی بیٹھا بڑی عالمانہ محویت سے پڑھ رہا ہے۔ کوئی مدبر نقشۂ جہاں بنا رہا ہے۔ یا کوئی جرنیل سامانِ حرب سمیٹ رہا ہے۔ کوئی قوی کسی کمزور کو پیٹ رہا ہے۔ یا کوئی فقیر اپنی خالی جھولی پھیلائے دستِ طلب بڑھائے پریشان سا ہے۔

کوئی بیوہ اپنی سونی آنکھوں میں لٹے لٹائے خواب لئے سسکتے جا رہی ہے۔ یا کوئی نیم عریاں بھکارن اپنے ناگفتہ بہ لباس میں نظر کو جھٹکے پہنچاتی گزری چلی جا رہی ہے۔ جیسے کوئی دیہاتی شہر پہنچ کر بوکھلا گیا ہے۔ یا کوئی اپاہج پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی معذوری دیکھ رہا ہے۔ کوئی مریض ہزیان بکنے لگا ہے۔ یا کوئی گناہگار سجدے میں گر پڑا ہے۔ جنگل میں کوئی شیر دہاڑنے لگا ہے۔ کسی ناگ نے اپنا خطرناک پھن کھول دیا ہے۔ کوئی بچھو اپنی ڈنک اٹھائے بھاگا جا رہا ہے۔ یا کسی سپنولے نے اپنے پہلے پہلے شوق میں کسی کو ڈس لیا ہے، کوئی مر گیا ہے۔

رحل پر قرآن رکھا ہوا ہے۔

کوئی بھولا خود کو یاد کرنے دیدہ و دل بھگونے لگا ہے۔ یا جیسے کسی سرپٹ دوڑ سے ہر طرف غبار ہی غبار پھیل گیا ہے۔ جیسے وسعت نے کہیں قہقہہ لگایا ہے اور تنگی نے کوئی آنسو بہایا ہے۔

فراز سربلند ہے مگر نشیب اچانک ہوک پڑا ہے۔ کوئی مچل مچل کر اپنی بپتا سنا رہا ہے۔ کوئی ہنس ہنس کر کسی کی افتاد دیکھ رہا ہے۔ جیسے غرق ہونے والا بچ جانے کی امید میں جلد جلد ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔

اور کوئی زندہ سلامت کنارے پر کھڑا موت وحیات کی کشمکش اور سمندر کی خطرناک کیفیت پر سراسیمہ ہے۔ کوئی تنگ دست آہ بھر رہا ہے۔

یا کوئی کوتاہ دامن کفِ افسوس مل رہا ہے۔ کسی قیدی کے پاؤں میں سلاسل ڈالے گئے ہیں یا کسی چور کی ہتھکڑی چھنچھنا رہی ہے۔ کوئی مضبوط شہتیر چٹخ گیا ہے۔ یا کوئی مستحکم ستون تھرتھرانے لگا ہے۔ جیسے کسی آتش فشاں نے اپنا دہانہ کھول دیا ہے۔ زمین کے سینے میں گڑھا پڑ گیا ہے۔ سمندر کے سینے میں بھنور۔ کوئی دلدل ابلنے لگا ہے۔ یا کسی بڑی چیز کو دیکھ کر نگاہ بے اختیار جھلس اور جل گئی ہے جیسے گرا ہوا ملبہ آخرکار سمیٹا جانے لگا ہے اور کوئی نیا قصر احتیاط و تمکنت سے ازسرِ نو بننے لگا ہے۔ موت و حیات دست بہ گریباں ہیں اور کوئی نڈھال ہوتی نظر سے دنیا کی بچھڑتی ہوئی بوقلمونی کو حسرت سے الوداع کہتی سوچ رہی ہے کاش کچھ زندگی اور مل جاتی تھوڑی سی مزید حیات اور...

غرض کہ موسیقی نے مجھے بے شمار جذبے دیئے اور ان سب کا یقین و ادراک بھی۔ مشاہدے اور اکتساب کے راستے گیت مجھے حسین وادیوں میں لے گئے اور پُرپیچ خطرناک کھائیوں میں بھی۔ گیت مجھے مرغزاروں میں ملے اور سنسان ڈراؤنے ویرانوں میں بھی۔ گیتوں نے مجھے اونچی فصیلیں چڑھائیں، اندھی خندقیں بھی جھنکوائیں۔ صاف ستھرے کشادہ راستوں پر گیت مجھے سیر تماشہ تفریح بن کر ملے اور بند گلی کوچوں میں گندگی، حبس اور گھٹن بن کر۔ گیتوں نے مجھے شہرت و افتخار کے روشن راستے بھی بتائے اور رسوائی و بدنامی کے اندھیرے کھڈ بھی۔ گیت مجھے کوہساروں اور کوہستانوں کے عظیم و محافظ سلسلے کی طرح اٹل اور سخت بھی لگے۔ اور کھلے میدانوں کی طرح فراخ اور مست مست بھی۔

امارت کے نشہ میں چور گیت بھی مجھے ملے۔ افلاس کے دُکھ میں مبتلا و اماندہ گیت بھی۔ شوخ چشم الھڑ گیت بھی۔ آبگوں نمناک گیت بھی۔ پرنالوں کی طرح پرشور گیت بھی، آبشاروں کی طرح سرکش اندھا دھند گیت بھی۔ سنجیدہ سنجیدہ گیت بھی، چنچل شرارتی گیت بھی۔ حالتِ فراق سے پارہ پارہ گیت بھی اور حالتِ

وصل سے رعنا و سرشار گیت بھی۔ کارناموں کی طرح شجیع بہادر گیت بھی اور شکستِ فاش کی طرح نامُراد گیت بھی۔ جنگ و جدل میں گرفتار گیت بھی، امن و سکون کے دلدادہ گیت بھی۔ گلزار، گلعذار گیت بھی، خارزار گیت بھی، زاہدوں کی طرح پابندِ فرض گیت بھی، شاعروں کی طرح رنگین مزاج گیت بھی۔ طربیہ گیت بھی۔ المیہ گیت بھی۔

مختصر یہ کہ کائنات کو دیکھنے کے لئے گیت میری آنکھ بن گئے۔ کائنات کو سونگھنے کے لئے گیت میری ناک، کائنات کو چکھنے کے لئے گیت میری زبان۔ کائنات کو محسوس کرنے کے لئے گیت میرا احساس، کائنات کو سمجھنے کے لئے گیت میرا ادراک، کائنات کو اخذ کرنے کے لئے گیت میرے جذبات، مسافت طے کرنے کے لئے گیت میرے قدم، کائنات کو تھام لینے کے لئے گیت میرے ہاتھ، کائنات سے محبت کرنے کے لئے گیت میرا گداز، پسندیدگی کو پکارنے کے لئے گیت میری آواز اور گیت ہی وہ وسیلہ ہے جو ایک دوڑتی بھاگتی ٹرین کی طرح مجھے اپنے اندر سمائے ہمیشہ گردش میں کہ لو یہاں وہاں گھومو۔ اپنا ہر شوق بہ شوق پورا کرو۔ تجربہ سمیٹنے کے عنوان کچھ ہنسو بولو۔ کچھ گمبھیر چپ چاپ رہو، مسرور و ہمکنار، بُردبار و باوقار۔ کسی عنوان یا بلا عنوان، متردّد و متجسس، بے فکر و بے نیام یاس و الم یا جوشِ طرب کے ہنگام، دنیا کو اپنے آپ میں قید کر لو کہ یہی اسیری، اور تنہائی دراصل حاصلِ حیات ہے۔

باغات کے قریب سے گزرتے ہوئے پھل، پھولدار درختوں کی مہک ضرور محسوس کرو اور دشت و جبل سے گزرتے ہوئے کائنات کا سونا پن اور استحکام، آبادیوں سے گزرتے ہوئے بشرہ رونق دیکھو اور ویرانوں اور قبرستانوں سے گزرتے ہوئے چہرۂ بے ثباتی و دہشتی کو امید جانو۔

تاریکی کو اسرار، حُسن کو ضیاء، حق کو غرور، چمن سے طراوت اور خوش رنگی کا امتزاج حاصل کرو اور سمندروں سے گہرائی اور جلال۔ پرندوں سے پرواز کا سبق لو۔ درندوں سے دہشت کا، منصفوں سے انصاف سیکھو۔ دوستوں سے دلداری۔

عدل کو ترازو جانو، وفاداری کو آدابِ زندگی، پاک دامنی کو تنویرِ بانو، آلودگی کو کیل کانٹا، ابن الوقتی کو نشیب، ستم کو عذاب، مہر و اخلاص اور شائستگی کو فراز ہی فراز۔ تمناؤں کو شادابی سمجھو، حوصلوں ولولوں کو جوششِ حیات، زندگی کو راہ نوردی۔ جادہ پیمائی صرف سفر اور سانس کو طرب و انبساط، آہنگِ حیات۔

نفرت و حقارت، طنز و تضحیک کو دشمن اور ظلم و زیادتی کو گُل ہوتے ہوئے چراغ جو خود اُجالوں سے محروم دوسروں کا دامن بھی اندھیروں سے بھر دیتے ہیں۔

شمس سے تابناکی، قمر سے خیرگی۔ ستاروں سے احساس رہنمائی حاصل کرو۔ شفق سے شرم، پھول سے غنائیت، ہوا سے تازگی، زمین سے زرخیزی اور درختوں سے طریقۂ زندگی سیکھو، خوشحالی سے تعاون و مدد لو۔

نکبت و افلاس سے جاں سوزی اور ہمدردی کا احساس انسان کو حاصلِ کائنات سمجھو۔

یوں گیتوں کے ہمراہ کائنات کا سفر کرتی ٹھمک ٹھمک کر گرتی۔ گرگر کر اُٹھتی دم لے لے کر آگے بڑھتی بالاخر میں اُس مقام تک پہنچ ہی گئی جہاں شعور کا ایک سفر ختم ہو جاتا ہے اور جہاں انسان ذرا رُک جاتا ہے۔ اپنی ہمت کو ایک دبیز لبادے ایک گرم کمبل، ایک ملائم ملبوس کی طرح اپنی ذات کے شانوں پر ڈال لیتا ہے، اور حاصل شدہ تمام تلخی، ترشی، کڑواہٹ اور مٹھاس کو، بدمزگی و ذائقے کو۔ حسرت و لذت کو، عافیت اور اضطراب کو، گناہ و ثواب کو، نفع و نقصان کو تجربات کے

باریک ذروں کی طرح فہم کی نفیس چھلنی میں چھان کر دیکھتا اور سوچتا ہے
کہ اس جہانِ خوش خرام، اس کاشانۂ آباد یا اس خانہ خراب میں زلیست
کے عنوان، گزر بسر کے نلطے، اُس نے کیا کھویا کیا پایا۔ کچھ حاصل بھی کر سکا
یا رہا سہا گنوا بیٹھا۔

کوئی سرمایہ، اثاثہ، خزانہ، کوئی نادر و نایاب چیز اس تمام کشمکش،
کشاکش، تگ و دو اور جد و جہد میں اُسے ملی بھی یا صرف وہ خالی جھولی
ہی اُس کے پاس رہ بچ گئی جو اُسے بے فکر، لاپرواہ، آرزوے معاش،
سے سہل اور حقیر استعمال کے عادی گداگروں کی قطار میں تو بے شک
لا کھڑا کر سکتی ہے مگر اُس صف میں ہرگز نہیں جو سورماؤں اور جیالوں کی
صف ہے شایانِ شان مقابلے کی حد۔

میں نے بھی ایک دبیز لبادہ، ایک گرم کمبل، ایک ملائم پیراہن
اپنی تگ و دو کے شانوں پر ڈال لیا ہے۔ اور میں اب بھی ایک
چھلنی کو عقل کے ہاتھوں میں سنبھالے جانے کیا کیا چھاپنے لگی ہوں۔
ڈرتی ہوں کہیں اس نازک و عمدہ چھلنی میں مہین ذرّوں کے درمیان
کوئی سخت کنکر، پتھر، غلیظ کوڑا کرکٹ یا ناقابلِ شناخت الابلا نہ
پھنس کر رہ جائے۔ کہیں یہ چھلنی کسی اچانک جھٹکے، کسی ناگاہ روکاوٹ
کسی ناقابلِ گزر اٹک سے ٹوٹ کر ناقابلِ استعمال نہ ہو جائے۔ لیکن
کسی علانیہ بازگشت کی طرح کوئی آواز برابر مجھے جتائے جاتی ہے
کہ جو اپنی انگلیوں کی حساس پوروں میں قلم پکڑ سکتے ہیں۔ اس
قلم کو صرف روشنائی میں نہیں بلکہ درد دل میں بھی تر بتر کر سکتے
ہیں جو دامن دنیا تھام سکتے ہیں۔ ارضی خد و خال اور زندگانی کے

کم و کاست کا صحیح صحیح حساب جان سکتے ہیں ۔ وہ بھی درحقیقت ہر محبِ وطن، ملک و قوم کا
کے ہر خادم، ہر حق پرست، محافظ، سورما کے برابر ہی بلند، جری، قابل اور خدمت گزار ہوتے ہیں
وہ اپنے ہاتھ پاؤں، اپنے دہن، اپنے بدن، اپنی جسمانی طاقت سے بھی زیادہ اس حصّۂ جسم
کے استعمال کے خوگر و عادی جو ذہن کہلاتا ہے اور اصل جولانگاہِ حیات ہے کہ جب تک
دیدہ و دل اور نظر و خیال بیدار ہیں تب تک یہ حصّۂ جسم بھی باوقار، باعثِ افتخار جو
کسی فاتح کا نہیں، کسی مطلق العنان کا نہیں، ہر خاص و عام کا نہیں بلکہ صرف اس فرد کا
ذہن ہو سکتا ہے جو قابلِ قربان، حساس اور مہربان و فراخ دل اپنے سینے میں رکھ سکتا ہے
جو ہر چیز کو صرف اسی لئے دیکھتا پرکھتا ہے کہ اس پر پڑی ہوئی دھول جھٹک ڈالے اُسے
چمکا دمکا کر صاف ستھرا اور بیش قیمت بنا ڈالے اور اگلے سفر سے قبل جو ناول میں اس
بار آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں جو دراصل ایک سوال ہے ۔

اہم سوال !

جوابات تو بہت ہو سکتے ہیں مگر یہ سوال صحیح جواب چاہتا ہے ۔ کیونکہ اس دنیا
میں جانے کتنے ذی رُوح ایسے ہیں جو زندگی کے نام پر سراسر تہمت ہیں اور تہمت میرا جواب
نہیں ۔

تو پھر بتایئے،

صحیح جواب کیا ہے بھلا ؟

اور اس سے پہلے کہ میں بات ختم کروں اعظم علی صاحب پروپرائٹر نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
کا دلی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جن کا خلوص و تعاون ہمیشہ مجھے حاصل رہا ۔ ویسے یہ ناول ۱۹۶۹ء
میں لکھا گیا مگر شائع اب ہو رہا ہے اور اس تاخیر کی تمام تر ذمہ داری ان حالات کے سر ہے جنھوں
نے مجھے دم لینے نہ دیا ۔

۲۱۶ - ایشیا ہاؤز، کرزن روڈ
نئی دہلی ۱ - فون نمبر ۳۸۱۳۰۸

۱

بی۔ اے کرنے کے بعد وہ بظاہر خاموش اور مطمئن جماعتی تحریک سے وابستہ مصروفِ عمل تھا۔ مگر اندر ہی اندر ایک ہی دُھن اور خواہش اس پر سوار تھی کہ کوئی سبیتا جیسا چہرہ ہو۔ سبیتا جیسا چہرہ!

سبیتا اس وقت کی مشہور فلم ایکٹرس تھی اور اُس کے چہرے کے نقوش نعیم کی آنکھوں میں جم کر رہ گئے تھے۔ یہ خد و خال اُس کی شدید خواہش و آرزو بن چکے تھے حالانکہ وہ فلمیں کم دیکھا کرتا تھا اور سبیتا کی اداکاری کے بارے میں بھی اُس کی کوئی خاص رائے نہیں تھی مگر سبیتا کا چہرہ اُس کا خواب ضرور بن چکا تھا۔ بے حد پسندیدہ خواب چنانچہ اُس کی پسند جان کر اُس کی بہنوں نے بڑی کوشش و تلاش سے ایسا چہرہ ڈھونڈ ہی لیا اور یہ چہرہ نعیم کا مقدر بن بھی گیا۔

جب آدمی اکیس بائیس برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو جائے اور اگلی ذمہ داریوں کی بات سوچنے لگے تو کوئی اور سمجھے نہ سمجھے لیکن وہ اپنے آپ کو بہت معقول اور گمبھیر فرد سمجھنے لگتا ہے اور چاہے اُس کی ذہانت اور تعلیمی قابلیت کتنی ہی تیز اور بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو، مگر اُس کے ذہن کا ایک حصہ ایسا فرد ہوتا ہے جو ناپختہ اور لاعلم ہوتا ہے۔ تجربات کا نچوڑ خود جسکا تجربہ نہیں ہوتا مگر جو پھر بھی خود کو ہر تجربہ کار آدمی کے مقابلے میں رکھتا بلکہ ہر جہاں دیدہ آدمی سے بھی زیادہ لائق فائق سمجھتا اور بے حد مسرور و شادماں رہتا ہے۔

زندگی ایک مرقع ہوتی ہے (چھوٹی بڑی مسرتوں، محسوس اور غیر محسوس غموں!

ناگزیر فکروں اور بے فکریوں کا۔ تاہم اکیس بائیس برس کی عمر میں انسان کا سب سے اہم اور جاندار خواب وہ مستقبل ہی ہوتا ہے جو بیاہ کے خوشنما قصر کے آگے رُک کر وقتی طور پر اور سب باتیں بھول جانا چاہتا ہے۔ کیونکہ زندگی حالات کیفیات واقعات اور جدوجہد کا مجموعہ ہی سہی مگر زندگی کی سب سے دلکش ادا ایک پسندیدہ ساتھی کی رفاقت ہی ہوتی ہے اور جب نعیم نے یہ رفاقت حاصل کر لی تو کچھ عرصہ کے لئے زندگی کے ہر دوسرے جذبہ کے لئے اُس کا جوش و خروش تھم سا گیا۔ اور وہ خود کو ہر ہر طرح مطمئن، مالامال اور کامیاب سمجھنے لگا۔ سبیتا جیسا چہرہ اُس کی دُلہن، اُس کی زندگی بن چکا تھا اور اس چہرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نعیم ہر ہر جذبے سے گزر جانا چاہتا تھا۔

نعیم نے اپنی زندگی دِقتوں کی دھوپ میں گزاری تھی اور یہ نعیم کی مستقل مزاجی ہی تھی جس نے سارے ناگفتہ بہ حالات کا تن تنہا مقابلہ کیا اور مشکلوں یا دُشواریوں کے آگے کبھی گھٹنے نہیں ٹیکے تھے۔ اُس نے عمدہ کھانا کھایا یا نہیں، عمدہ لباس پہنا یا نہیں آسائشوں کی تمنا محسوس کی یا نہیں۔ مگر اپنے ذہن کی اُس آنچ کو لپک لینے اور نہاتے رہنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی جو اُس کے مستقبل کا راستہ متعین کرتی تھی۔ وہ ایک دُبلا پتلا باتونی نوجوان تھا۔ سرخی مائل بھوری آنکھیں، گھنے اُلجھے ہوئے بال اور مضبوط جبڑے والا انسان جسکے چہرے پر چمک اور فراست تھی۔ جس کی نگاہ ہوشیار اور چوکنّی تھی۔ جس کی خوش گفتاری کا ہر کوئی مداح اور معترف تھا۔ مگر ذہانت کے ساتھ ساتھ جس کے چہرے پر سختی کا ہلکا سا پرتو بھی برابر قائم رہتا تھا۔ جب اُس نے اپنی دلہن کے چہرے سے گھونگٹ اُٹھا تو ایکدم سرشار ہو گیا۔ اُس کا خشک جسم اور تنہا دل ایک نرم اور گداز کیفیت سے پھڑک اُٹھا۔ وہ دیر تک اپنی دُلہن کو دیکھتا اور خوش ہوتا رہا۔ کیونکہ سبیتا جیسے چہرے والی لڑکی دلکش تھی، تعلیم یافتہ تھی اور اُس لچکیلی شاخ کی طرح تھی جسے ابھی ہر سمت جھکایا اور موڑا جاسکتا تھا۔ جو بے زبان سی معلوم ہوتی تھی اور نعیم کی ہر بات اور خیال کی پذیرائی کے لئے

مکمل رُجحان اور رغبت کے ساتھ مائل تھی۔ ایک بالغ لڑکی ہونے کے باوجود جو اپنا کوئی خاص مطمحِ نظر یا انداز نہ رکھتی تھی۔ نعیم نے سوچا یہ تو اور بھی اچھا ہوا۔ کیونکہ اب وہ اِسے جلد سے جلد اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکے گا۔

لڑکی متموّل گھرانے کی تھی۔ اُس نے اچھا کھایا۔ اچھا پہنا اور بہتر سے بہتر خواہش سے ہمکنار رہی تھی۔ جو اپنی تربیت کے تحت شوہر کو ہی سب کچھ سمجھنے پر مجبور تھی۔ وہ اسکول اور کالج کی بہترین طالبہ رہی تھی۔ بہترین کھلاڑی لیکن دُلہن بنتے ہی جو بالکل چھوئی موئی بن گئی تھی اور جس کے اونچے قہقہے دفعتاً اس طرح دب گئے تھے جیسے یہ جان لینے کے بے حد خواہشمند اور متمنّی ہو گئے ہوں کہ اُس کے شوہر کے نزدیک قہقہے کی کیا اہمیت اور افادیت ہے۔ نہیں وہ قہقہے کو بُرا تو نہیں سمجھتا، بے باکی تو نہیں سمجھتا اور صرف تبسّم کا خواہاں تو نہیں۔ مگر جب نعیم نے اس کے ساتھ مِل کر قہقہے لگائے اور اُسے یقین دلایا کہ قہقہہ شگفتگی اور شادابی کے لئے، زندگی کے لئے ضروری ہے، تو انیسہ کی ذات میں ایک کہکشاں سی اُبھر آئی۔ میرا شوہر بُرا نہیں۔ اُس نے سوچا اور خود بھی اِترانے، خوش ہونے لگی۔

انیسہ ہر بات تحکمانہ انداز میں کرنے کی عادی تھی اور اپنے تحکمانہ لب و لہجہ کو شاندار بھی سمجھتی تھی مگر دُلہن بن کر نئے لوگوں کے درمیان آنے کے بعد اُس کا لہجہ خود بخود نرم اور متین بن گیا، خود بخود سوالی بن گیا۔ اُسے اِس نئے گھر کو، اس گھر کے ہر فرد کو تسخیر کرنا تھا اور اس امر کے لئے جھکنا اور نرم بننا بے حد ضروری تھا۔ لہٰذا اُس نے اپنے مزاج کا رعب اور دبدبہ بھولے سے بھی کبھی نہیں برتا۔ کیونکہ وہ نرمی حاصل کرنے کے لئے نرمی برتنا بھی ضروری سمجھنے لگی تھی اور اُس کے نرم بن جانے سے زندگی خود بھی نرم و ملائم اور گداز گداز ہو گئی تھی۔ جب بھی وہ اپنے سسرالیوں کو اپنے جہیز کے سامان سے بھرپور اور جگمگاتا ہوا دیکھتی تو اُس کا دل فخر و غرور سے

بھر جاتا۔ جب بھی آنے جانے والوں سے اپنے والدین کی امارت کا چرچا اور تذکرہ سنتی تو خود بھی پھول کر غبارہ بن جاتی اور جب جب اپنے بیاہ کی طویل ترین اور مسلسل کئی ماہ تک ایک سلسلہ کی طرح چلتی ہوئی تقاریب کا حوالہ سنتی، اپنے بیش قیمت جہیز کی رہ رہ کے تعریف سنتی تو خوشی سے پھولے نہ سماتی اور خود کو پورے سسرال پر ایک شامیانے کی طرح تنا ہوا سایہ فگن محسوس کرتی۔ اُسے شدت سے احساس ہونے لگتا کہ اس گھر کو اُس کی سخت ضرورت تھی ورنہ شاید یہ ہمیشہ خالی خالی سونا اور بے رونق ہی رہ جاتا یا اُس کی بجائے اگر کوئی اور ہستی بھی اس گھر میں آجاتی تب بھی یہ گھر شاید اتنا بارونق نہ ہو سکتا جتنا اب اُس کے آنے کی صورت میں ہو چکا تھا۔ اور یہی وہ غالب احساس تھا جس نے انیسہ کو بہت زیادہ سوچنے سمجھنے کی مہلت و اجازت نہیں دی اس پر حاوی اور مسلط ہوتی گئی اور انیسہ یہ بھولنے لگی کہ اُسے اِس گھر میں آئے بہت تھوڑا عرصہ ہوا ہے۔ اُسے اپنے ارد گرد سے بھی اور واقف ہونا ہے۔ نعیم کی روح کی تہہ تک اُترنا ہے۔ فرداً فرداً سب کو جیتنا ہے۔ وہ تو بس اپنے ہی احساس میں بُتلا اور مگن ہونے لگی تھی اور نعیم کو خوش اور ہر کسی کو اپنے اطراف گھومتا ہوا دیکھ دیکھ کر حد سے زیادہ چاق و چوبند اور فاخر۔ پھر جب سال بھر بعد ہی وہ ماں بن گئی تو اپنی آغوش میں ایک ننھے وجود کو ہمکتا ہوا پا کر اُس کی مسرت میں ایک بالکل نیا اور گہرا رنگ پیدا ہو گیا۔ بچے کی پیدائش کے بعد وہ اپنی سہیلیوں کی رسی بھی سرگوشیاں اپنی لاابالیانہ دیدہ دلیریاں۔ اپنے شباب کے محبوب آرزو و ارمان۔ اپنا حُسن سب کچھ بھول بھال گئی حتیٰ کہ اپنے شوہر تک کو اپنی گود کے بچے میں مدغم اور ضم محسوس کرنے لگی۔

یہاں اُس کی زندگی میں ایک چھوٹا سا وقفہ آ گیا۔ ایک غیر محسوس سا وقفہ جس نے اُسے محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ غیر شعوری طور پر وہ نعیم کو نظر انداز کرنے لگی ہے۔ وہ نعیم کو مزید سمجھنے، مزید حاصل کرنے، مزید اپنانے کی بجائے محض اس خیال و قیاس سے ہی مرفہ

ہے کہ وہ نعیم کے بچّے کی ماں بھی بن چکی ہے۔

انیسہ فطرتاً باتونی اور پُرگو لڑکی تھی۔ دلہناپے کے حجاب نے اُس کی گویائی کو ترا دیا کا جو لبادہ اوڑھا دیا تھا وہ نعیم کی علانیہ سرپرستی سے محض ایک بیرونی اور اوپری چیز کی طرح جلد ہی تار تار ہو گیا اور اس لبادے کے اندر سے پھر وہی انیسہ نکل آئی جو از خود باتونی تھی۔ جو گھنٹوں بے روک ٹوک بولنا جانتی تھی جو پہل کی بے حد عادی تھی اور اس انیسہ کو دیکھ کر تھوڑے ہی عرصہ میں نعیم محسوس کرنے لگا کہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود انیسہ بہت ادھوری اور نامکمل سی رہ گئی ہے۔ اُس کی شخصیت کا کوئی پہلو بھی ایسا اہم یا خاص نہیں ہے جو اُسے ذہن نشین کر لینے میں معاون و مددگار ہو سکے۔ نعیم کی دانست میں انیسہ کو مزید بننا تو سنوارنا اپنے آپ کو تشکیل دینا تھا۔ چنانچہ ایک روز نعیم نے اُس سے کہا:

"ہمیشہ باتیں کرتے رہنے کی بجائے کچھ پڑھا کرو انیسہ۔ کتابیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں۔ معلومات سے پُر۔"

"کیا میں کتابوں سے واقف نہیں ہوں؟" انیسہ نے جواب دیا۔

"تم نے تو صرف کورس کی کتابیں ہی پڑھی ہوں گی۔ اب کچھ ایسی کتابیں بھی پڑھ ڈالو جو صرف نصابی نہیں بلکہ ساری دنیا سے وابستہ نئی نئی کیفیات سے معمور ہوں۔"

انیسہ فوراً آمادہ ہو گئی کیونکہ اس نے سمجھ لیا کہ ان کتابوں میں شاید وہ سب کچھ ہے جو نعیم کو پسند ہے، نعیم کی رغبت ہے۔ پھر نعیم نے کتابیں لا دیں اور انیسہ بہ دل و جان اُنہیں پڑھنے لگی مگر کچھ دنوں بعد جب نعیم نے اُس سے پوچھا۔ "بتاؤ تم نے کیا کیا پڑھ ڈالا۔ تمہیں کتنی نئی باتیں معلوم ہو گئیں انیسہ؟" تو انیسہ جھجک گئی۔ تھم تھم کر بولی "کتابیں تو میں نے پڑھ لی ہیں نعیم مگر پتہ نہیں کیوں وہ مجھے بہت دلچسپ نہیں معلوم ہوئیں۔ کچھ عجیب و غریب کتابیں ہیں وہ۔"

"او پگلی لڑکی!" نعیم نے ہنس کر کہا۔ "کتابوں کو بیگانہ سا نہ کرو۔ تمہیں تو بیگ

نہیں بننا ہے بلکہ انہیں سمجھ کر پڑھا کرو۔ کوشش سے ذہن نشین کرو کیونکہ کتابیں صرف اوراق ہی نہیں، الفاظ ہی نہیں معنی و مطالب کے چہرے ہوتی ہیں۔ اور جب تم کوئی نیا چہرہ دیکھتی ہو تو کیا کچھ نئے خیال تمہارے ذہن میں نہیں آتے ؟" "آتے ہیں" انیسہ جلدی سے بولی "مگر چہرے کتابوں جتنے مشکل نہیں ہوتے۔ وہ فوراً ظاہر کر دیتے ہیں کہ کیا ہیں، کیسے ہیں۔" "مگر کیا بتائے بغیر تم اُن کے خد و خال سے خود ہی اُن کی بابت کچھ نہیں سمجھ سکتیں۔ اُن کا کردار، طبیعتیں، عادتیں، کیا سب کچھ بتانا ہی ضروری ہوتا ہے ہمیشہ ؟"

"صاف بات ہے۔ خوبصورت چہرے خوبصورت ہوتے ہیں اور بدصورت چہرے بدصورت۔" "مگر صرف خد و خال ہی سب کچھ نہیں۔ باطن بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ لہذا کتابوں کو بھی اسی طرح پرکھو۔ اپنی ایک پسند ناپسند تو ہونا ہی چاہیے۔" پسند ناپسند ؟ انیسہ نے سنبھل کر سوچا۔ کیا اپنی پسند ناپسند اتنی ضروری، اتنی اہم ہوتی ہے ؟ اُسے تو بس اتنا معلوم تھا کہ اچھے چہرے نگاہ کو گرفت میں لے لیتے ہیں اور بدشکل چہرے نظر کو خود بخود واپس لوٹا دیتے ہیں۔ اُسے کئی چہرے پسند تھے کئی ناپسند۔ مگر کتابیں چہرے کیسے ہو سکتی ہیں بھلا! کتابیں آنکھ ناک، کان، زبان تو رکھتی ہی نہیں۔ کتابیں جن کے موضوع الگ الگ تھے متن الگ الگ، اندازِ تحریر، اسلوب اور مفہوم الگ الگ تب اُسے نعیم پر ہنسی آنے لگی۔ شاید نعیم اس پر اپنے علم کا رعب جمانا چاہتا ہے۔ آخر یہ باطن ہوتا کیا ہے ؟ اُس نے ساری کتابوں کو ایک دوسرے پر ڈھیر کر دیا اور نعیم کی تاکید سے بے پرواہ پھر باتوں اور اپنے قیاسوں میں غرق ہو گئی۔ ٹھیک ہے۔ جو کچھ ہے، جیسا اچھا ہے وہی سب ٹھیک ہے۔ وہ کوئی عالم فاضل تو ہے نہیں۔ حرکت ایک عمل ہے جو اپنے آپ ہوتا ہے اور اپنی کیفیتوں کو خود بخود ظاہر کر دیتا ہے۔ مگر علم سے اکتساب کا مرحلہ اتنا آسان تو نہیں جس طرح انسان بہت سی زندگی گزار لینے کے بعد ہی تجربہ کار ہو سکتا ہے اسی طرح گھنٹوں اور دنوں میں قابل بن جانا بھی ممکن نہیں۔ دو اُس نے ابھی عمر ہی کونسی گزاری ہے جو نعیم اُسے دانشمندی کی کسوٹی پر پرکھنے لگ جائے۔

اُس کی چہل، چنچل پن، اُس کے شباب کو متاثر کرے۔ ابھی زندگی کی تگ و دو کے لئے بہت وقت پڑا ہے پہلے ذرا وہ ہنس بول تو لے۔ زندگی کو جوان اور مالا مال تو محسوس کر لے پھر خشک اور ادق چیزیں بھی برداشت کر لے گی۔ سب کچھ سیکھ اور سمجھ لے گی۔ لیکن نعیم کو انیسہ کا یہ استدلال اور بے توجہی پسند نہیں آئی۔ اتنا کھلنڈرا پن اور بے تعلقی ذرا بھی نہیں بھاتی۔ "زندگی مختصر ہوتی ہے انیسہ!" نعیم نے سنجیدگی سے کہا۔ "زندگی سے جو کچھ حاصل کرنا ہے جلد جلد حاصل کر لو۔" مگر اُس کے پہلو میں پڑی انیسہ کب کی خراٹے بھرنے لگی تھی۔ جب سے نعیم نے اُس کی ذہنی تربیت کا بیڑا اٹھایا تھا انیسہ کو نیند بہت جلد آ جانے لگی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے بستر پر لیٹ جانے کے باوجود وہ گھنٹوں جاگتی اور نعیم سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ اُسے خود نعیم کی نیند سے شکایت تھی کہ وہ گفتگو کے دوران سو کیوں جاتا ہے مگر اب صورت بالکل ہی مختلف تھی۔ جب سے نئی ساڑیوں، نئے تحفوں، نئی تفریحوں کی بات ذرا مدہم اور سست پڑ گئی تھی انیسہ کو اپنی، بے حد خوشگوار ازدواجی زندگی بھی کچھ پھیکی پھیکی ماند ماند محسوس ہونے لگی تھی۔ اپنے کنوار پن میں تو اُس نے سدا ایک بنے بنائے طریقے پر عمل کیا تھا۔ جہاں ہر چیز اپنے وقت پر پابندی سے ہو جایا کرتی تھی۔ تفریحیں بھی متعین سی تھیں۔ مگر بیاہ کے بعد اُسے ایک نئی آزادی ملی تھی۔ آنے جانے کے لئے مقامات، وقت بے وقت اپنی فرمائشیں پوری کروانے کی نئی چاشنی نئی قسم کے سیر سپاٹے مصروفیات، ہمیشہ سرشار رہنے کا نیا لطف اور لذّت۔ لہٰذا جب اِن دلچسپیوں کی تازگی اور طوالت دھیرے دھیرے گھٹنے لگی۔ فرمائشیں ادھوری رہ جانے لگیں تو انیسہ اکتانے لگی۔ اگر گود میں آ جانے والا بچہ فوراً ہی اُس کی مسرت نہ بن جاتا تو شاید وہ نعیم کی مصروفیات اور مطالعے سے بھی اُوب جاتی۔ مگر اب نعیم سے ذرا سا دور ہو کر بھی وہ اپنی خواہشات کے خلاء کو بڑی حد تک اپنے بچے سے پُر کرنے لگی تھی اور یہی مسرت و مدہوشی اُس کی زندگی تھی۔

اب نعیم صرف اُس کا خوب صورت خواب ہی نہ رہ گیا تھا بلکہ زیادہ تر شوہر محسوس ہونے لگا تھا۔ جسکی نرمی میں بھی ایک قسم کی سختی پیدا ہو چکی تھی۔ اور سب کے سارے برتاؤ میں ایک مخفی قسم کا جذبۂ تغلب نمایاں ہونے لگا تھا۔

نیا ماحول، نیا سکھ، نئی آزادی پانے کے باوجود انیسہ ابتک بھی ایک پابند مزاج ہستی تھی۔ اپنے پُرانے مزاج کی عادی، مخلوط تہذیبی ملاقاتوں اور سرگرمیوں کی غیر عادی، نعیم کے نت نئے دوستوں سے تعارف کے سلسلہ میں متعجب و حیران۔ ایک خاص نظر سے ہر چیز کو دیکھنے پرکھنے کی خواہشمند اور اپنے اس مخصوص انداز میں شوہر کی اطاعت اور خوشنودی کی طالب مگر جب نعیم نے ان ساری عادتوں کو رفتہ رفتہ مہمل قرار دے دیا اور دن بدن انیسہ کو انفرادی آزادی اور مضبوطی سے واقف و آگاہ کر دیا تو انیسہ بھی تیزی سے بدلنے لگی۔ اب تک بھی وہ نعیم سے مرعوب تھی اور اُس کی مرضی کو بڑی اپنائیت کے ساتھ قبول کر لیا کرتی تھی مگر پھر جب نعیم نے خود اُس میں نئی نئی عادتیں پیدا کر دیں۔ اُس سے نت نئی توقعات وابستہ کرنے لگا تو محبت کے ساتھ ساتھ انیسہ اُس سے ہلکا خوف بھی محسوس کرنے لگی کیونکہ نعیم کی نت نئی خواہشوں سے ٹکرا ٹکرا کر خود اُس کی اپنی نظر، اس کا اپنا انداز شکستہ ٹوٹا پھوٹا سا محسوس ہونے لگا۔ انیسہ نے خود بھی محسوس کیا کہ اُس کی معلومات بے حد محدود ہیں۔ اُس کا تمام مزاج اور سماجی رویہ غیر یقینی اور ناپختہ کیونکہ سب سے پیش آنے کا انیسہ کے پاس ایک ہی طریقہ تھا اور اردگرد پر ہوتے ہوتے بھی انیسہ کی نظر اپنے آپ پر ہی سب سے زیادہ تھی مگر اب جب اُسے قدم قدم پر مختلف اور متضاد شخصیتوں سے واسطہ پڑنے لگا۔ خود سے زیادہ دوسروں پر نظر ڈالنا پڑی۔ دوسروں کو پہچاننا، انہیں اُن کا درست مقام دینا پڑا تو انیسہ بوکھلا گئی۔ شاید وہ وہ نہیں جو سمجھی جا رہی ہے۔ جو بنا بنا کر پیش کی جا رہی ہے اور جو وہ سمجھی جا رہی ہے

اگر وہ غلط ثابت ہو جائے تو ۔؟ جس طرح نعیم اُسے دیکھنا چاہتا ہے وہ ویسی ہی نظر نہ آسکے تو ۔؟ جو نعیم اُسے بنانا چاہتا ہے، ویسی ہی نہ بن سکے تو ۔؟ کیا اُس کی اہمیت گھٹ نہ جائے گی ۔ کیا یہ اُس کی اپنی تعلیم و تربیت، اُس کی انا، پر ایک حرف نہ ہوگا ؟ پہلی بار انیسہ کے ذہن نے ایک ہلکا سا جھٹکا محسوس کیا ۔ نعیم نے اُسے یہ کس مخمصے میں پھنسا دیا ۔ وہ کیا چاہتا ہے آخر ۔؟ وہ ایک دم محتاط ہو گئی ۔ اُس نے تہیہ کیا کہ اب تک کی اپنی لاعلم شخصیت کو تہ کر کے کسی تاریک کونے میں ڈال دے گی اور اسے بالکل بھول بھال کر اُس ادنیٰ گولے کی شکل اختیار کرنا شروع کرے گی جو ماہر اور خواہشمند ہاتھوں میں ایک سے دوسری سلائی پر بڑی آسانی اور سہولت سے منتقل ہو کر بہتر سے بہتر شیپ اختیار کر سکتا ۔ اچھے سے اچھا ڈیزائن پیش کر سکتا ہے اور اس خیال و ارادے کے ساتھ ہی جراٴت مندانہ مقابلے کے لئے اُسی کے سارے پسپا عادات و اطوار دفعتاً سنبھل گئے ۔ اُس نے اپنے پہلے مزاج کو پرانی کتاب کے پھٹے ہوئے بوسیدہ اوراق کی طرح خود اپنے ہاتھوں سے پرے اُچھال دیا اور قدرے سکون و اطمینان کے ساتھ خود کو باور کرانے لگی کہ وہ بے وقوف نہیں ہے، وہ خوف زدہ نہیں ہے ۔ وہ نعیم سے یا اپنے آپ سے بھی شرمندہ یا گھبرائی ہوئی نہیں ہے ۔ کیونکہ وہ سب کچھ سیکھ سکتی ہے، بنا سکتی ہے، ہر صورت حال کا مقابلہ کر سکتی ہے ۔ اُسے یہ سب کرنا ہی ہے اگر نا ہی چاہیئے ۔ اُسے دوسروں کا رعب محسوس کرنے کی بجائے خود اپنا رعب بھی دوسروں پر ڈالنا چاہیئے ۔ چنانچہ اُس نے ڈھیر کی ہوئی کتابوں کو پھر کھولا اور دلچسپی محسوس نہ ہونے کے باوجود انہیں اُلٹنے لگی ۔

زندگی کے اس موڑ تک وہ اپنے ہی ذہن کی مالک تھی الھڑ مگر مخصوص مزاج کا نمونہ مگر اس موڑ پر پہنچنے کے بعد اُس میں رفتہ رفتہ لاوٹ پیدا ہونے

لگی ہر نئے نامانوس خیال و اقدام کے بعد اُس کا دل شدت سے مچلنے لگتا۔ اُسے روک تھام کر اپنے مخصوص مزاج کی طرف واپس لے جانا چاہتا مگر ہر بار ایک انجانا خوف، ایک نامعلق اندیشہ، ایک مبہم خدشہ درمیان میں آجاتا۔ نعیم آسے للکارتا محسوس ہوتا اور ہر بار اپنے دل کی شدید دھڑکن بھول کر اپنے مزاج و میلان کے بغیر ہی وہ آگے بڑھ جانے پر مجبور ہو جاتی۔ اپنے ہر اگلے اور نئے قدم کو ترقی اور نعیم کی یقینی تسخیر سمجھنے پر مُصر و مائل ہو جاتی۔ اس طرح ایک دھوکہ، ایک مسلسل دھوکا اُس کے وجود سے لپٹ کر رہ گیا اور دن بدن اس دھوکے کی تہہ موٹی اور دبیز ہوتی گئی۔ اُس کے ذاتی استحکام اور اعتماد کی جڑیں کھوکھلی کرنے لگی۔ اُس کی ہر حرکت اپنا پن اور بے ساختگی چھیننے لگی۔ تب انیسہ کی حرکتیں اُس کے اپنے مزاج کا فوری ردِعمل نہ رہیں بلکہ خوب سوچ سمجھ کر کی گئی حرکتوں کے زمرے میں شامل ہو گئیں جو اپنے ذاتی ادراک اور خواہش کی بجائے ایک منصوبے، ایک اسکیم کی پیداوار اور رہینِ منت ہو گئیں۔ انیسہ کی فطری شوخی اور بے فکری اس ناموس بوجھ تلے دب کر متاثر ہونے لگی۔ خود کو ہر طرح اہل ثابت کرنے کی قوی کوشش میں وہ ایک روپوش فکر اور مسلسل جھلاہٹ سے بے بس خود کو اُس شکار کی طرح دیکھنے لگی جو نرغے میں پھنس چکا ہو۔ جس کی رہائی کی اب کوئی صورت ممکن نہ رہی ہو اور ذہنی تضاد کے اس شکنجے میں جکڑے جا کر پھر انیسہ کو اکثر و بیشتر جذباتی افراتفری اور احساساتی تنزل کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس کی خاموش اکتاہٹ کی جگہ ایک دبی ہوئی برہمی لینے لگی۔ اپنے اطراف کا ماحول اسے بے حد مشکل معلوم ہونے لگا۔ تب لوگوں کی مداح سرائی اور تعریفوں سے بھی اُسے وہ خالص خوشی میسر نہ آنے لگی جو کبھی اُس کی بے فکری کا فخر و غرور تھی۔ اُس کی ذاتی اہمیت کی معاون و مددگار۔ نہ ہی اس گھر میں اب اُسے اپنے جہیز کا سامان قیمتی بیش بہا اور حد سے زیادہ محسوس ہونے لگا کیونکہ ازدواجی زندگی کی ابتدائی مسرت

سے گزر جانے کے بعد ذرا غور اور توجہ کرنے پر نعیم کی ہر ہر نگاہ اس سامان کا خاموش مضحکہ اڑاتی، اس کی قیمت، افادیت، خوبصورتی، اس کی فراوانی سے قطعی بے بہرہ اس کی نفی کرتی محسوس ہونے لگی جیسے نعیم کی زبان تو خاموش ہو مگر نظر علانیہ کہتی ہو۔ اپنے ساتھ لائے ہوئے اس ذخیرے پر نہ اتراؤ بلکہ فخر کرنا، اترانا فروری ہی ہے تو خود اپنے آپ پر اِتراؤ مگر کیا تم خود اپنی شخصیت پر اترانے کے قابل ہو؟

اور انیسہ اُلجھ اُلجھ کر سوچتی، نعیم کی نظر کو یہ کہنے کا کیا حق ہے وہ اُس کے جہیز اور اُس کی انا کا مضحکہ نہیں اُڑا سکتا۔ اُسے ایسا ناگوار انداز نہیں اختیار کرنا چاہیے مگر یہ سب سوچنے کے باوجود انیسہ نعیم کی خاموش فہمایش اور اُس کی ڈھکی چھپی تضحیک کو روک نہ سکتی تھی، نعیم کو ایسے رویئے سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ اگر اُسے نعیم سے محبت نہ ہوتی تو شاید وہ اس بکھیڑے کا کوئی تدارک کر ہی ڈالتی۔ مگر اب تو وہ خود ایک گرداب میں پھنس کر رہ گئی تھی اور اُس کی اپنی ہر ہر حرکت و جنبش اُسے مزید اندر ہی اندر دھنسائے جا رہی تھی۔ ایسے حالات میں اُس کی محبت میں کوفت اور شک کا ایک شائبہ اچانک سر اُٹھانے لگا۔ کہیں نعیم اپنے بے رنگ بے رونق گھر کے لئے اس بے بہا سامان کو ایک چیلنج تو نہیں سمجھتا؟ اپنے کمزور معاشی حالات پر ایک تہمت ایک حرف! کیا وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب ہے؟ یہ سامان جو نعیم کا اپنا مہیا کیا ہوا نہ سہی مگر جواب خود اُس کی ملک بن چکا۔ اُس کی اپنی ضرورتیں پوری کرتا۔ اُس کا اپنا کہلاتا ہے۔ تو پھر یہ اجتناب یہ پوشیدہ حقارت یہ لاتعلقی کس لئے۔ اگر نعیم کی انا اتنی ہی طاقتور اور حساس تھی تو وہ ایک ایسے گھر پر سوالی بن کر گیا ہی کیوں جہاں وہ کھلے دل دماغ کے ساتھ قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ نعیم نے اُس گھر سے کچھ حاصل ہی کیوں کیا جسے وہ اپنا نہیں مان سکتا تھا۔ کیا وہ اُس گھر کے متعلق سب کچھ نہیں جانتا تھا۔ جس چیز کو خود اپنی تمنّا سے حاصل کر رہا تھا اُس کی قدر و قیمت نوعیت نہیں سمجھتا پہچانتا

تھا۔ یقیناً یہ بیاہ ممکن نہ ہو سکتا اگر اُس توسط کا پاس و لحاظ کیا جاتا جس توسط سے نعیم کا رشتہ اُس کے گھر آیا تھا اور اُس کے والدین ہاں کرنے پر مجبور ہو گئے تھے لیکن اپنی مدافعت اپنی تسکین کی یہ ساری سوچ بھی اب انیسہ کو مطمئن نہ کر پاتی۔ اُسے تسلّی نہ پہنچاتی بلکہ اُلٹا زخمی اور مغروب کر ڈالتی۔ ہر مدافعت کے باوجود کوئی انیسہ سے ہر وقت یہی کہے جاتا کہ خود کو چھپانے کے لئے، خود کو بچانے کے لئے اپنے والدین کی امارت کا سہارا مت لو۔ قیمتی سامان کی ملکیت اور اہمیت کو اپنی حفاظتی ڈھال مت بناؤ۔ یہ بودی ڈھال اُس مضبوط دھار دار تلوار کے کاری وار کو ہرگز نہ روک سکے گی جو نعیم کی نظر اور فکر میں پنہاں ہے۔ بے شک ڈھال ہی تلوار کا مقابلہ کر سکتی۔ وار کو روک سکتی ہے۔ مگر نوکیلی سنگینوں، تیز برچھوں اور مہارت سے کئے گئے واروں کے آگے ڈھال ٹوٹ کر ٹکڑے بھی تو ہو سکتی ہے۔

اور انیسہ گھبرا گھبرا کر ہر طرف دیکھنے لگ جاتی۔

یہ کون ہے جو بول رہا ہے، کون جو اُسے خوفزدہ کرنے کا ایک پروگرام سا بنائے ہوئے ہے؟ پھر اپنے تنہا وجود کے غیر مطمئن توازن سے بے کل و بیقرار وہ فوراً لوگوں کے درمیان جا بیٹھتی۔ اِدھر اُدھر کے تذکرے سُنتے یا سُنانے لگتی۔ تھوڑی دیر کے لئے اُلجھن سے نجات پا جاتی۔ پرائے قہقہے خود اُس کا سکون اور دل بھلائی بن جاتے مگر کب تک؟ نعیم کوئی اجنبی تو نہیں تھا جس سے اُس کا پل دو پل یا چند گھنٹوں کا واسطہ ہوتا۔ نعیم تو اُس کی کُل زندگی تھا۔ سارا مستقبل تو پھر وہ اُس سے کس طرح بچتی۔ کب تک بچ سکتی؟

وہ رہ رہ کے کوئی ایسا طریقہ سوچنے لگی، کوئی ایسا لائحہ عمل جو اُس کے اور نعیم کے درمیان اُٹھتی ہوئی دیوار کو یکلخت ڈھا دے، تہ و بالا کر دے۔ لیکن جس راہ پر چل کر چلنے کے لئے وہ اکتھا ہوتے تھے وہ کچھ اس طرح منقسم ہو گئی تھی کہ جس کے ایک

سرے پر نعیم تھا اور دوسرے پر وہ خود کھڑی اُس درمیانی فاصلے کو تک رہی تھی جو اُن کے قدموں سے سرک کر نکل گیا تھا اور جس کو از سرِ نو طے کرنا اب خود انیسہ کو بیحد مشکل محسوس ہو رہا تھا۔

اور جب انیسہ یہ سب سوچ رہی تھی ٹھیک اُسی وقت نعیم بھی کچھ ایسے ہی سوالات اپنے آپ سے کر رہا تھا۔ انیسہ نعیم کی خواہش تھی، خواہش کی مسرت۔ نعیم نے بڑے جتن اور شوق سے اُسے حاصل کیا تھا۔ وہ اُس سے ٹوٹ کر محبت کرتا، اُسے حفاظت سے رکھنا چاہتا تھا۔ مگر ازدواجی زندگی کا کچھ ہی عرصہ گزار لینے کے بعد نعیم محسوس کرنے لگا کہ وہ بھرپور رفاقت جس کا وہ خواہشمند تھا اُسے نہیں مل سکی۔ پہلے پہل اُسے انیسہ کا کوئی مزاج ہی نہیں محسوس ہوا پھر اُس کی شہ پا کر جب وہ کھلنے اور ظاہر ہونے لگی تو نعیم نے محسوس کیا کہ انیسہ اُس کی پسند سے بہت مختلف ہے۔ اُس کی توقع اور اُمید سے بالکل ہی جداگانہ۔ وہ متمول گھرانے کی ٹھیٹ لڑکی ہے جسکے ہر ہر رُخ پر تموّل کی گہری چھاپ کندہ ہے۔ جس کے اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، ہنسنے بولنے، لوگوں سے ملنے جلنے حتیٰ کہ سونے جاگنے تک پر اندازِ تموّل کے گہرے نشان ہیں۔ نعیم انیسہ کے گھرانے کے متعلق سب کچھ جانتا تھا۔ اُس گھر کی تمامتر شان وشوکت سے واقف تھا مگر اُس کا خیال تھا کہ حاصل کر لینے کے بعد وہ انیسہ کو بدل ڈالے گا۔ اُسے اپنے رنگ میں رنگ لے گا محبت اور اپنائیت سے اُسے بالکل جیت لے گا۔ چنانچہ خوب ہنس بول لینے، زندگی کو ایک پسندیدہ چیز کی طرح برت لینے، شباب سے جی بھر محظوظ ہو لینے کے بعد نعیم نے دانستہ انیسہ کا رجحان بدلنا بھی شروع کیا تھا۔ اُس کے ذہنی سُدھار کی خاطر اُسے سنجیدگی اور مطالعے کی طرف مائل بھی کیا تھا۔ اپنے ساتھ ساتھ ہر جگہ لانے لیجانے بھی لگا تھا۔ تاکہ اس طرح دنیا میں آمیز ہو کر انیسہ نت نئی باتیں محسوس کرے، سیکھے اور پھر ان میں سے مطلب کی باتیں اور طور طریقے اپنا لے مگر جوں جوں دن گزرنے لگے،

نعیم اُس کی تربیت پر زیادہ دھیان دینے لگا۔ اُسے انیسہ کی طرف سے خوف اور خدشہ ہونے لگا۔ یہ اندیشہ اور وسوسہ کہ شاید یہ وہ عورت نہیں جو اُسے درکار تھی۔ اُس نے انیسہ کو بڑی مسرت سے قبول کیا تھا مگر پھر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ سبیتا کے چہرے کی تلاش میں کہیں اُس نے کوئی فاش غلطی تو نہیں کر ڈالی۔ کہیں اُس خاص چہرے کے حصول کی کوشش و تمنا میں وہ خود اپنے آپ سے بہت دور تو نہیں نکل گیا۔

اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اگر انیسہ اُس کی خواہش کے قالب میں نہ ڈھل سکی۔ جو وہ اُسے بنانا چاہتا ہے وہ نہ بن سکی تو...؟ وہ اُن باتوں کی کتنی دلدادہ ہے جنکی نعیم کے پاس کوئی اہمیت یا افادیت نہیں۔ اُن عادتوں کی کتنی عادی جو نعیم کی اپنی عادتیں نہیں۔ اُس نے تعلیم ضرور حاصل کی۔ مناسب تربیت بھی پائی پھر بھی دقت ضرورت مڑنے لچکنے اور کوئی امتیازی شکل اختیار کرنے کے لئے اس کا ذہن کتنا سخت، پتھریلا، کتنا ناقابلِ لچک اور ناہموار ہے۔

یہ سب سوچ سوچ کر نعیم اپنے احساس میں ایک مستقل اُلجھن محسوس کرنے لگا۔ کڑوے خیال کا کسیلاپن، زہریلی نوک کی چبھن۔

اب کیا ہوگا۔ اب کیا ہو سکتا ہے...؟

بہت کوشش پر بھی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ مرد کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے آشنا ہوتی ہیں مگر مرد آنسو نہیں بہایا کرتے۔ وہ آنسو پی لیتے یا بھول جاتے ہیں۔ کیونکہ آنسو استقلال کو متاثر اور ارادے کو کمزور کرتے ہیں۔ لہٰذا نعیم نے بھی اپنے وہ دردناک آنسو پونچھ ڈالے جو اُس کی خواہش کے قتل سے کھنچ کر اُس کی ناامیدی اور مایوسی کی آنکھوں میں آگئے تھے۔ پھر اپنے ان آنسوؤں کو بھول کے، انیسہ کو عارضی طور پر نظرانداز کر کے وہ اپنے گھٹنوں گھٹنوں سرکتے بچے سے دل بہلانے میں مصروف ہو گیا کہ شاید وقت کوئی راستہ سوجھا دے۔ وہ جانتا تھا کہ بچہ اس کی ایک بات بھی

نہیں سمجھ سکتا۔ پھر بھی وہ ضرور اس سے کہتا: "اے میرے وجود کے ننھے ذرّے میری ارتقا پذیر آرزو تجھے بڑھنا، پھلنا پھولنا مبارک ہو مگر اے میری خوبصورت تخلیق تو میری امیدوں کو درہم برہم نہ کرنا۔ اپنی ماں کی چھاتی سے دودھ ضرور پینا مگر جب تیری سمجھ کو قدم ملیں تو صرف میری فکر کے راستہ پر چلنا۔ کیونکہ عورتیں فکر سے انصاف نہیں کرتیں۔ مگر بچے پھر بھی ہمیشہ عورتوں کی گود میں ہی پلتے ہیں۔

اپنے ناسمجھ بچّے سے حالِ دل کہہ کے نعیم کو یک گونہ سکون اور عافیت حاصل ہو جاتی۔ اُس کے انتشار پر پھاہا سا لگ جاتا۔ وہ تمام کڑوے اور تلخ گھونٹ جو انیسہ کے بارے میں پریشان ہو ہو کر اس کے جذبات اور احساسات کے حلق سے گزرا کرتے اپنا کسیلا پن اور چبھن فراموش کر دیتے۔ انتہائی سنجیدہ ہوتے ہوئے بھی پھر وہ بچّے کے ساتھ خود بچہ بن جاتا اور نعیم کا یہ روپ انیسہ کے لئے بھی باعث تسکین ہوتا۔ اُس کے بھی ذہن سے وقتی طور پر تشویش کا آہنی پنجہ ہٹا لینے والا۔ وہ چاہتی نعیم اسی طرح اپنے بچے کے ساتھ منہمک رہے، کیونکہ بچہ ہی اب وہ مرکز تھا جو اُن کا توازن، مسرت اور ملاپ تھا۔ ورنہ فرصت ملتے ہی نعیم کے لکچر شروع ہو جاتے۔

کچھ کرو انیسہ، کچھ کرو! کھانا بنانا، سینا پرونا، لوگوں سے گپ بازی کر لینا کوئی کام نہیں۔ یہ سب کوئی بھی کر سکتا ہے۔ لیکن اہم اور ذہنی کام کرنے والے کتنے کم ہیں۔ اُن میں اضافہ کرو۔ اہم بنو، تعلیمی سند صرف تمغہ نہیں ایک ذمہ داری بھی ہے اور سب پیدائش کے موقع سے ہی عالم، فاضل عقلمند نہیں ہوتے۔ سیکھنے کی خواہش ہی سب کو سکھاتی، سمجھاتی، سنوارتی ہے۔ سیکھنا ہی اشد ضروری ہے۔ اہم ہے۔

انیسہ چڑ جاتی گویا وہ کچھ کئے بغیر ہی زندہ ہے۔ کیا زندگی کا بوجھ سنبھالنا خود ایک ذمہ داری نہیں؟ ٹھیک ہے کہ وہ پہلے پہلی ان باتوں سے بے حد متاثر

ہوئی تھی۔ نعیم کی پہلو دار شخصیت اور ذہانت کا اس پر خاصہ رعب بھی طاری رہا تھا۔
بلکہ ایسی ساری باتیں از خود بڑی گمبھیر اور رعب دار محسوس ہوتی تھیں مگر رفتہ رفتہ
جب وہ اِن پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرنے لگی تو بہت جلد اسے پتہ چل گیا
کہ یہ سُلنے میں جس قدر مرعوب کُن ہیں اُتنی دوران عمل نہیں۔ چنانچہ وہ ہر ایسی خلش
اور کھٹک سے جو گھڑیال کے پنڈولم کی طرح ہمیشہ اُس کے دماغ میں ہلتی بجتی رہے
خود کو محفوظ کر لینے کی تمنائی ہوتی گئی۔ وہ ایسی باتیں سوچنا، سمجھنا یاد رکھنا نہیں
چاہتی تھی جن کی اُسمیں سکت اور صلاحیت نہیں تھی۔ اُس نے کوشش تو ضرور
کی تھی مگر خود کو یکسر بدل ڈالنے میں بالکل کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی
نعیم کی بڑھتی ہوئی خاموشی، بے رُخی، تغافل اُس کے لئے دل خوش کن نہیں مگر وہ
نعیم کو فقط ناصح کے روپ میں قبول کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ سوچ سوچ کر عاجز ہو جانے
ممکنہ کوشش کر ڈالنے اور تھک جانے کے بعد ایک نئی قسم کی جرأت انیسہ میں
جاگنے لگی۔ لہذا پھر وہ خود بھی نعیم پر کڑی نظر رکھنے اور اُس کی نگرانی کرنے لگی۔
خود بھی اُس سے یہ نہ کرو، وہ نہ کرو کہنے جتانے لگی چنانچہ ایک رات اُن دونوں
میں کھُلا ٹکراؤ ہو گیا۔

"تم آدھی آدھی رات تک کہاں رہتے ہو، وقت پر گھر کیوں نہیں آتے؟"
انیسہ نے تلخی سے پوچھا۔

"جلد لوٹ کر کروں بھی کیا۔ تم صرف ماں بن کر خوش ہو تم وہ عورت نہیں
بن سکیں جو پہلو دار ہو، جو دوسرے دل پر قابض ہو سکتی ہو"

"پھر بھی مجھ سے بچنا دُور رہنا کب تک چل سکے گا آخر؟"

"سنو!" نعیم نے لاپرواہی سے کہا۔ "ہم نے بیاہ کیا ہے مگر ہم قیدی نہیں
ہیں اب مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ سوالات بیکار ہوتے ہیں۔ سوالات مسائل کا حل نہیں۔"

"پھر بھی ایک نہ ایک دن تمہیں بتانا ہی پڑے گا کہ یہ سب کیا ہے؟ یہ زندگی کا کونسا طریقہ ہے؟ تمہیں میری ضرورت نہیں تھی تو تم نے شادی ہی کیوں کی؟ اپنے علم اور اصولوں کے ساتھ ہی کیوں خوش نہ رہ گئے۔"

"تو کیا تم چاہتی ہو کہ میں کام بھی نہ کروں۔ ہر وقت گھر میں پڑا اینڈتا رہوں۔ یہ مجھ سے ممکن نہیں۔ کام ہی میرا مسلک ہے، کام ہی میری زندگی ہے۔ میں تمہاری طرح وقت گنوا نہیں سکتا نہ تمہیں بتا بتا کر، جتا جتا کر کام کر سکتا ہوں۔"

"مگر کونسا کام، کیا کام، تم سے ایک معمولی سی ملازمت تک نہ ہو سکی اور جتا یوں رہے ہو جیسے دنیا کے اہم ترین کام میں منہمک ہو۔"

"کتنی بار کہوں میں ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔"

"ہاں کیونکہ وہ ملازمت میرے بابا دلا رہے تھے نا۔ اس لئے۔"

"کوئی بھی دلاتے مجھے اس سے مطلب نہیں۔"

"صاف صاف کیوں نہیں کہتے تمہیں میرے لوگوں سے چڑ ہے۔ تم انہیں اپنا نہیں مانتے۔"

"میں انہیں غیر بھی تو نہیں سمجھتا مگر اس بات کو تم کب سمجھو گی کہ میرے ان کے درمیان صرف غربت اور امارت ہی کی نہیں بلکہ نظریات کی بھی جنگ ہے۔ نظریاتی اختلافات کا بھی فاصلہ۔ اگر تم اس فاصلے کو نہیں جانو گی تو خود اپنے آپ سے بھی کبھی انصاف نہیں کر سکو گی کیونکہ اب تم خود دو ہستیوں، دو نظریات اور دو قسم کی طرز حیات کے درمیان بٹ چکی ہو۔ تمہیں اپنا پچھلا وجود تحلیل کرنا اور ایک نیا حقیقی وجود اختیار کرنا ہے جو اس آرائشی مجسمے کی طرح نہیں ہونا چاہئے جسے ایک پیڈسٹل سے اتار کر کسی بھی دوسرے پیڈسٹل پر فوراً کھڑا کر دیا جا سکے۔"

"تم باتیں خوب کر لیتے ہو، باتوں میں مجھے ہرا بھی سکتے ہو۔ مگر میں ایسی باتیں

اور نہیں سننا، نہیں سمجھنا چاہتی جو فقط دلوں کو میلا کریں۔ محبت اور اپنایت کو چوٹ پہنچائیں۔ چاہو تو مجھے دقیانوس سمجھو اور بے وقوف کہہ لو مگر میں نے تو آج تک کوئی ایسا مکان نہیں دیکھا جو صرف دیواروں کے سہارے مکمل ہو سکا ہو۔ جیسے چھت کی ضرورت نہ ہو اور جس میں چھت کے بغیر مکیں رہ بھی لیتے ہوں"

"یہی تو افسوس ہے کہ تم خود جو سمجھنا چاہتی ہو سمجھ لیتی ہو لیکن میں جو کچھ تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں وہ تمہاری سمجھ میں آتا ہی نہیں"

اور یہ کہتے ہوئے نعیم کے لہجے کے تاسف و تنفر کو محسوس کر کے انیسہ انفطراری طور پر برسوں کا اپنایا ہوا یہ خیال بھی بھول گئی کہ وہ ایک بیوی ہے جسے شوہر کی برابری کرنے کا کوئی حق و اختیار نہیں۔ جو شوہر سے اونچی آواز میں بات کرنے کی مجاز بھی نہیں بلکہ بے حد جوش سے چلا کر پھر اُس نے کہا:

"نعیم! نعیم، صرف اپنے بچاؤ کے لئے میری نفی نہ کرو۔ ہر انسان مختلف جذبات و خیالات کا حامل ہی سہی مگر کیا ہر چیز ایک لازمی توازن نہیں چاہتی۔ اپنی ایک خاص شکل نہیں رکھتی اور اُسی سے قابلِ قبول اور مانوس نہیں سمجھی جاتی۔ کیا سب کو آپس میں ٹکرا ٹکرا کر کوئی بھی چیز بچائی یا باقی رکھی جا سکتی ہے؟" اُس کی آواز رندھ گئی اور نعیم نے دفعتہً خاموشی اختیار کر لی۔

خاموشی جو ایک اُبھرا ہوا سوال تھی جس کے جواب کی انیسہ بے حد متمنی اور متلاشی تھی۔ جو نعیم کا کرب تھی مگر انیسہ کی فہم سے بالا تھی جو دونوں کے درمیان رُک گئی تھی۔ اس واقعے کے کچھ دیر بعد تھکا ہارا نعیم سو بھی گیا مگر اُس رات انیسہ برابر جاگتی رہی۔ جاگتی اور سوچتی رہی کہ جو کچھ ہوا مناسب بھی ہوا یا نہیں۔ اُسے مغرور رہنا چاہیئے یا پشیمان اور سامنے پھیلی ہوئی زندگی کے وسیع میدان سے سبزے کو بالکل ہی ختم ہونا، مٹتا دیکھ کر چند آنسو اچانک انیسہ کی آنکھیں بھگو گئے۔ دکھ کر پہلے ہم نصیب

حتیٰ کہ رات ختم ہو گئی، صبح طلوع ہوئی۔ صبح نعیم ہمیشہ سے بہت جلد گھر سے رخصت ہو گیا اور دوپہر میں کھانے کے لئے گھر بھی نہیں آیا۔ یہ بڑی عجیب دوپہر تھی۔ انیسہ کی زندگی کی ہر دوپہر سے بالکل ہی مختلف جو روشن ہونے کے باوجود روشن نہ تھی۔ جس میں سائے دکھ کا پھیلا ہوا تھا۔ تھے ام کی پہلی اُداسی اور شدید کرب دُور دُور تک ہر طرف پھیلا اور ملا ہوا تھا۔ یہ بڑی بوجھل دوپہر تھی اور انیسہ رہ رہ کے محسوس کر رہی تھی کہ نعیم سے ٹکراؤ نے عقدے کھولے نہیں بلکہ گرہیں اور بڑھا دی ہیں۔ شکوہ و تردد کا سلسلہ اور دراز اور لایعنی ہو گیا ہے۔ تب یکایک انیسہ کو اپنی پہلی غلطی کا احساس ہوا۔ اُسے بات اس طرح نہیں شروع کرنا چاہیئے تھی، جس طرح اُس نے کی لیکن اب وہ کیا کرے۔ کس طرح اپنی خفگی اور برہمی کا ازالہ کرے کیا نعیم سے معافی مانگ لے؟ وہ بے تابی سے نعیم کا انتظار کرنے لگی۔ اُسے یقین تھا، اُس رات نعیم جلد گھر لوٹ آئے گا۔ خود معافی نہ بھی مانگے تو احساس شرمساری کے تحت کوئی نہ کوئی پیش قدمی ضرور کرے گا۔ مگر جب آدھی رات گزر گئی اور نعیم واپس نہ لوٹا تو نرم، پشیمان، ملول و متاسف انیسہ پھر تیز اور تند خو ہونے لگی پھر کرب سے کچھ کھا کر تاؤ پیچ کھانے لگی۔ شاید نعیم ازالہ نہیں چاہتا۔ گزشتہ رات کی تلخی کو اور بڑھانا، بھڑکانا چاہتا ہے۔ جھلاہٹ کے تیز تموج نے انیسہ کو پھر بے درد، بے قابو، درہم برہم کر دیا۔ پھر ایک جانگسل طوفان، مخالف جذبات کا ایک ہنگامہ اُس میں برپا ہو گیا۔ یہ کیا ہے کیا؟ انیسہ نے سوچا محض کوئی بھول عارضی کیفیت یا دکھ و الم کی مستقل ابتدا۔ ایک جنگ کا آغاز یا ہر چیز کو فنا، بھسم اور خاکستر کر دینے کا شیطانی خیال؟ اس کا خالص انسانی درد اس کا سوز و گداز انتظار خود اس کا منھ چڑانے، مضحکہ اُڑانے لگے۔ اپنے احساس سے پھانس نکالتی ہوئی انیسہ پھر یکلخت ذکیلی دھار دار بن گئی اُس نے فوراً فیصلہ کیا کہ اب وہ اور انتظار نہیں کرے گی نعیم جب چاہے آئے یا رات بھر نہ آئے۔

وہ خود کو ہلکان نہیں کرے گی۔ رو رو کر جاگ جاگ کر اپنی آنکھیں خراب نہیں کرے گی چنانچہ ایک نئے عزم کے ساتھ وہ بستر پر جا پڑی اور سونے کی کوشش کرنے لگی مگر نیند اُس کی آنکھوں میں آگ بن چکی تھی اور شعلے اُس کی ہستی کو جھلسائے دے رہے تھے کہ بالآخر نعیم لوٹا اور دھنگھائی سے بولا:

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

انیسہ ہڑبڑا کر اُٹھی وہ فیصلہ وتحمل سے نعیم کو کھانا کھانے پر مائل کرنا چاہتی تھی۔ مگر کچھ توقف سے نعیم نے اپنا بقیہ جملہ پورا کیا۔ "میں نے باہر کھانا کھا لیا ہے۔" تو جیسے کسی نے انیسہ کو تھپڑ مار دیا۔ وہ تڑپ کر بیٹھی اور بھڑک کر بولی: "تو اب روز کھانا باہر ہی ہوگا! مبارک ہو! رہا سہا یہ ایک رشتہ بھی گھر سے ٹوٹ گیا سمجھو۔" نعیم بھی تمام رنجش نہیں رہا۔ کراہٹ سے بولا: "رات دیر ہو گئی اسی لئے آتا ہوں کہ تم سو چکو مگر تم نے تو مجھے عاجز کرنے کا ایک محاذ بنا لیا ہے جیسے رات تک کو رات نہیں سمجھتیں۔" پھر مزید کچھ سنے بغیر سمجھنے کی زحمت برداشت کئے بغیر وہ سونے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ اُس نے گرم کر کبھی انیسہ کی طرف نہیں دیکھا۔

انیسہ کی ساری ہستی آنسو بن گئی۔ اس کا بے اختیار جی چاہا کہ پالنے میں سوئے ہوئے بچے کو جھنجھوڑ ڈالے اور خود اپنی کوکھ میں پنپنے والے نعیم کے دوسرے بچے کو بھی کسی طرح اپنے اندر سے نوچ کر کھینچ کر پھینک ڈالے کیونکہ اُس وقت انیسہ کو ہر ہر چیز فقط بوجھ محسوس ہو رہی تھی۔ ناقابلِ برداشت بوجھ، مگر اگلے ہی لمحے اُس کی کیفیت یکسر بدل گئی۔ شدتِ احساس سے لپک کر وہ پالنے کے قریب پہنچی اور سوئے ہوئے بچے کو جھپٹ کر اپنی گود میں بھر لیا۔ بچہ بچہ کو سینے سے لگائے وہ بار اُڑی اور بے اختیار سسکنے لگی۔

یہ آنی دونوں کا دوسرا علاحدہ اور پہلا ٹکراؤ تھا

پہلے ٹکراؤ میں دونوں کبھی سخت، کبھی نرم اور متحمل بھی ہو گئے تھے مگر اس دوسرے

ٹکراؤ میں دونوں اپنی جگہ سخت اور مستحکم ہو رہے۔ دونوں کو قطعی طور پر احساس ہوگیا کہ وہ ایک دوسرے کے لئے نہیں بنے مگر اب جب کسی غلط اتفاق یا غلط ارزنہ اور کوشش کی وجہ سے باہم ہو چکے اب ایک کا بالکلیہ خاتمہ یقینی ٹھہرا۔ ایک کی قربانی۔ ایک کی تباہی خودروی یا شاید دونوں ہی کی کیونکہ بات اشاروں کنایوں سے آگے بڑھ چکی تھی اور دونوں طرف سے شدت سے خود کو منوانا چاہتی تھی۔

انیسہ نے اب پہلی مرتبہ پورے وثوق سے تسلیم کر لیا کہ نعیم اُسے نہیں چاہتا۔ اُسے پسند نہیں کرتا۔ اُس سے پیار نہیں کر سکتا۔ اُس کے لئے ذرا سا بھی گداز اپنے اندر نہیں رکھتا اور یہ ایک ایسا جان لیوا خیال تھا جس نے انیسہ کے تمام وجود کو اپنی تنگ مٹھی میں جکڑ لیا۔ اور یہ دوسرا نامناسب ونا مانوس جھٹکا تھا جو پوری ناخوشگواری اور شدت سے انیسہ کی فہم اور خوش فہمی کو لگا۔ جس نے اُس کی تمام ہستی کو بالکل خالی ڈھنڈار کر دیا۔ اور اپنے وجود کی اس ویرانی میں بھی اُسے دور سے ایک ہی بازگشت سنائی دی: "تمہارا ایف اے کوئی کام نہ آئے گا۔ ہو سکے تو اور پڑھو۔ کم از کم بی اے کرو۔ خود کو کاٹھ کباڑ بننے سے بچاؤ..."
تب انیسہ نے شوق سے نہیں، علم کی لگن اور جستجو سے نہیں، نعیم کی خواہش کی پاسداری یا حکم کی تکمیل کے لئے بھی نہیں بلکہ محض ضد میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی دھن پکڑ لی۔ وہ نعیم پر ثابت کر دینا چاہتی تھی کہ اُسے غلط سمجھا گیا ہے۔ نعیم اُسے سمجھ ہی نہیں سکا ہے۔ اُس نے نیت کر لیا۔ خواہ کچھ ہو جائے، وہ آگے پڑھے گی۔ بہت پڑھے گی۔ بلکہ اب تو جلد یا بدیر نعیم پر حاوی ہو کر رہے گی۔ نعیم کو نیچا دکھائے گی۔ نعیم جو اب اُس کی تحقیر اُس کی نفی کر رہا ہے تب اُس سے شرمندہ ہونے پر مجبور ہو جائے گا اور انیسہ چوکنی ہو گئی مگر اُس کی سب سے بڑی اور قریبی خوشی علانیہ اُس کے اندر مر گئی۔ اب وہ صرف اُس گھڑی کو لپک لینے کے لئے بے تاب ہو گئی۔ جب نعیم کا سر اپنے قدموں میں جھکا دیکھے اور خود فخر سے سر اُٹھائے کھڑی رہے۔

اِس تناؤ کے بعد اُدھر خود نعیم کا سب سے اچھا اور عمدہ خواب آناً فاناً برباد ہوگیا۔ انیتا کو بدلنے اپنے مطابق بنانے کی ہر کوشش اس کا مُنھ چڑانے اس کے ارادوں پر قہقہے لگانے لگی سبیتا کا چہرہ دھندلا گیا۔ سبیتا کے پسندیدہ خوبصورت خدوخال اُلجھ کر بالکل مسخ ہو گئے بلکہ نعیم نے اب سبیتا سے سخت نفرت اور جھنجھلاہٹ محسوس کی۔

کمبخت چہرہ.....! کمبخت چہرہ.....!!

اس چہرے کی تلاش میں وہ کتنے غلط راستے پر چل پڑا تھا۔ خود سے کتنا دور نکل گیا تھا۔ اگر یہ چہرہ ہی اُس کی خواہش نہ ہوتا تو شاید غلط سمت کبھی اُس کے قدموں تلے نہ آتی۔ کوئی بھی دوسرا چہرہ اُس کی زندگی بن جاتا اور شاید وہ دوسرا چہرہ نعیم کو زیادہ عزیز رکھتا۔ خود زیادہ عزیز ہوتا۔ اس کے خیالات اور خواہشات سے زیادہ ہم آہنگ ہوتا۔ یوں ایک دوسرے کو کھو دینے کا لمحہ اُن کی زندگیوں میں کبھی نہ آتا مگر اب.....؟

نعیم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اپنی بیوی کو نہیں چاہ سکے گا۔ کیونکہ اُس میں تو چاہے جانے اور چاہنے کے سوتے پھوٹے ہوئے تھے مگر اب یہ تمام سوتے یکلخت سوکھ گئے اور نعیم کی ذات میں بہتا ہوا ملائمت کا جھرنا اپنے آپ بند ہوگیا۔ زندگی، یکایک بے فیض خشک بنجر نظر آنے لگی۔ ایک عجیب سے خلاء نے اس کی شخصیت کو یکایک محصور کرلیا اور کوئی آرزو کوئی تمنا کوئی خواہش اس کی زخم خوردہ زندگی کو سنبھال نہ سکی۔ اس کا سہارا نہ بن سکی۔

ہر انسان کے آگے صرف ایک ہی کام، ایک ہی مصروفیت، ایک ہی جذبہ نہیں ہوتا۔ زندگی گوناگوں اور بے شمار مصروفیتوں سے عبارت ہوتی ہے۔ لیکن جس انسان کا دل محبت سے خالی ہو جائے۔ زندگی کے بُنیادی جذبے اور سرچشمے کو کھو دے وہ پھر سدا کیلئے خالی اور ہیبتناک بن جاتا ہے پھر اس کے سامنے ہر اہم مقصد بھی دھندلا جاتا ہے۔ اپنی اہمیت غرض و غایت کھو دیتا ہے۔ بیشتر انسان پہلی چوٹ بھول کر

دل کے خلاء کو دوسری بار بھی بھر لیتے ہیں۔ شاید کئی بار بھر سکتے ہیں مگر نعیم جس کے سامنے ہمیشہ ہی مضبوط اور مناسب آئیڈیلیسٹ مار ہے تھے۔ جس نے اپنی تمام توانائی کو ایک مطمحِ نظر ایک مقصد کے پیچھے لگائے رکھی تھی جسے اپنے آپ پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ تھا پہلی ہی چوٹ سے اتنا بے بس بے ارادہ مضمحل اور شکست خوردہ ہو گیا کہ پھر خود اپنی زندگی کا جواز بھی اس کی سمجھ سے باہر ہونے لگا اور اب جب اُسے انیسہ کی ضرورت بھی نہیں رہ گئی تھی تُسے اِس بات کی فکر بھی نہیں رہی کہ وہ کیا کرتی ہے۔ کیا کرنا چاہتی ہے، اسے کیا کرنا چاہیے۔

اگلے کئی دن یونہی سے گزر گئے۔ تہی داماں، تہی داماں سے پھر ایک رات انیسہ نے خود اسے مخاطب کر کے سنجیدگی سے کہا کہ وہ اپنے مائیکے جانا چاہتی ہے تاکہ گھریلو ذمہ داریوں اور بچوں کی فکر سے بے فکر ہو کر اطمینان سے بی۔ اے کر لے۔ نعیم نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ نعیم کو یہ خیال کافی پسند آیا۔ کیونکہ اُس کے تحت الشعور میں انیسہ سے بچاؤ کی جو خواہش پیدا ہو گئی تھی وہ اس خیال سے ایک راہ پانے لگی۔ اپنی نجات دہندہ محسوس ہوتی۔ "ٹھیک ہے"۔ نعیم نے انیسہ سے کہا۔ "شاید اس طرح تم کوئی نصب العین بنا سکو۔ کوئی مقصد پا سکو۔ کوئی ایسی راہ جو زندگی کی شاہراہ سے ملتی ہو اور جہاں سے کئی راستے نکلتے ہوں۔"

اس گفتگو کے بعد ٹکراؤ قدرے دھیما پڑ گیا۔ تلخی، ضد جوش و خروش اور دونوں طرف کا اُبال ایک ایسے مرکز پر متحد ہونے لگا جو علیحدہ علیحدہ مرکز تھے۔ مگر کچھ دیر کے لئے مشترک اور ملے جلے محسوس ہونے لگے۔ انیسہ کے اُلجھے اور ایک دوسرے میں پھنسے ہوئے خیالات جھاگ کی طرح دبنے لگے۔ اُس نے سوچا واقعی اب وہ محض ایک الھڑ لڑکی نہیں رہی ہے، ایک عورت بن چکی ہے۔ عورت جسکے تقاضے ایک لڑکی کے تقاضوں سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ اپنے لئے زیادہ

تحمل اور غور و فکر چاہتے ہیں اور وہ عورت جو ماں بھی بن چکی ہو صرف اپنی ہی بنا ء
اور غرض و غایت کے لئے نہیں جی سکتی۔ وہ دیر تک کسی چیز سے نفرت نہیں کر سکتی۔
دیر تک کسی چیز کی مخالفت نہیں کر سکتی۔ دیر تک دوری نہیں اختیار کر سکتی۔ وہ موت
کی خواہش بھی نہیں کر سکتی اور غیور سے غیور خود دار سے خود دار یا جاہل سے جاہل
ماں بھی خود کو بھلا کر بھول کر صرف وہی کرنے پر مجبور ہوتی ہے جو اس کے بچوں کی
حیات، حفاظت، ارتقاء و بقا بن سکے۔ ان کی طاقت اور صحت مندی جسکے لئے
اُسے ہر نفرت کو اپنے اندر جھیلنا پڑتا ہے۔ مخالفت میں بھی موافقت کا کوئی نہ کوئی
پہلو تلاش کرنا اور ایسی راہ چُننا پڑتا ہے جو خود کے لئے پسندیدہ یا فائدہ بخش نہ
ہو۔ مگر بچوں کے لئے ضرور ہموار اور غیر دشوار ہو۔ انیسہ نے اپنے والدین کی متواتر
اور محبت سے لبریز چمکیلی زندگی بھی دیکھی تھی اور اس زندگی کا اثر اس کے لاشعور
پر اتنا گہرا اور محیط تھا کہ محض اپنے فطری جوش امارت کی دلدارگی اور اپنی اندھا دھند
دوڑ سے گر پڑنے کے باوجود اُس نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور وقتی طور پر سب
کچھ بھول جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھنے لگی۔ چنانچہ اپنی بیزاری اور بے رخی کو بالائے
طاق رکھ کر روانگی سے قبل اُس نے نعیم سے کہا:

"وعدہ کرو کہ تم آئندہ کوئی غلط بات نہیں سوچو گے۔ کوئی غلط حرکت نہیں
کرو گے۔ ایسی لکیریں نہیں کھینچو گے جو خواہ مخواہ راستوں کو بانٹتی، الگ کرتی ہوں۔
کیونکہ یہ بات قطعی ہے نعیم کہ راستے کتنے ہی مختلف ہوں، کتنے ہی دوراہوں، سہ
راہوں، چوراہوں میں بٹے ہوتے سہی مگر کہیں نہ کہیں خود بخود ایک دوسرے سے مل
جاتے ہیں۔ دور، دور کے راستے بھی اشتراک اور اتصال کے لئے اپنا ایک مرکز،
ایک مقام ضرور رکھتے ہیں اور اعتماد و اپنائیت کے بغیر کوئی متنفس بھی زندگی کی
تہمت برداشت نہیں کر سکتا۔ زندگی کو خوبی اور خوش اسلوبی سے برت نہیں سکتا۔"

انیسہ نے اپنا سر نعیم کے کندھے پر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ سبکنے لگی۔ نعیم نے یکگونہ حیرت اور تیز نظر سے انیسہ کو دیکھا۔ یہ خود انیسہ بول رہی ہے یا اس کا درد...؟ اسے یہ بھی ہوئی محسوس...؟ اس کی چوٹ زدہ انا.....؟ اور یہی بار نعیم نے محسوس کیا کہ انیسہ اتنی کور ذہن نہیں جتنی وہ سمجھ بیٹھا تھا۔ تاہم ناپسندیدہ کشاکش کے بعد خود کو سنبھالنے خود کو دوبارہ اکھٹا کرنے، خود کو از سرِ نو سمیٹنے اور مجتمع کرنے کے لئے وہ تھوڑی تنہائی ضرور چاہتا تھا۔ وہ اس خیال کے لئے اپنے ذہن کو بالکل تیار کر چکا تھا کہ کچھ عرصہ انیسہ سے دُور ہٹ جانے، الگ ہو جانے میں ہی اس کی اپنی بہتری بھی ہے۔ چنانچہ اس نے انیسہ کو یاد دلایا: "تم ایک اچھے خیال کا تعاقب کر رہی ہو اسے ٹوٹنے بکھرنے نہ دو۔ کچھ دنوں کے لئے دوسری ہر بات بھول جاؤ۔ صرف اپنی تعلیم پر توجہ دو پھر خود تمہیں احساس ہو جائے گا کہ زندگی محض سہولت یا عیش و طرب نہیں۔ زندگی دیوانے کا خواب بھی نہیں۔ زندگی آزمائشوں سے پُر مشکل ضرور ہے مگر بہت قیمتی چیز ہے۔ زندگی بار بار نہیں ملتی۔ بس اب تم فوراً اپنے مائیکے چلی جاؤ اور اس بات کی پوری کوشش کرو کہ اپنے طور پر کچھ بن سکو۔ کچھ کہلا سکو۔ اپنی صلاحیت اور قابلیت سے کوئی مناسب مقام پا سکو!"

نعیم نے انیسہ کا سر اپنے کندھے سے سرکایا نہیں حتیٰ کہ انیسہ نے خود اسے اٹھایا! اور تب ایک ہی بات ایک ہی خواہش اس کے تمام جسم و جان میں لہرا کر رہ گئی کہ اسے ذہنی طور پر اور آگے بڑھنا، مضبوط ہونا اور ترقی پانا ہے۔ فہم و فراست کی اس حد کو ضرور چھونا ہے، جہاں نعیم قابلِ تسخیر ہو۔ جہاں اس کی جیت اس کی مسرتوں کی انتہا بن جائے۔ جس کی اپنی فتح کہلائے۔

اس کی کوکھ میں نعیم کا دوسرا بچہ پنپتا، پروان چڑھتا رہا اور ذہن میں تعلیم کے حصول کا خیال۔ پروا نہیں سیکھنے میں ساری عمر ہی کیوں نہ ختم ہو جائے۔ زندگی کو کسی نہ کسی عنوان گزرنا تو ہے ہی۔

چند دنوں میں نعیم نے بی۔ اے کے کورس کی تمام کتابیں خرید ڈالیں اور کتابیں آجانے کے دوسرے ہی دن انیسہ اپنے والدین کے گھر منتقل ہوگئی۔ انیسہ پھر ایک بار، طالب علم بن گئی۔ اپنے کم عمر بچے کو اُس نے اپنی والدہ اور بہنوں کی نگرانی میں دے دیا اور نعیم اب اس کا چند گھنٹوں کا ساتھی بن کر رہ گیا۔ اُن کی زندگی محض ویسا ہی ایک سلسلہ بن گئی جیسے دنیا کے اکثر سلسلے ہوا کرتے ہیں۔ محبت کا جذبہ انیسہ میں ہو تو ہو مگر نعیم کی ذات سے بالکل نکل چکا تھا۔ رفاقت کے چند مہینوں کے بعد ہی نعیم کی محبت ایسا انداز اختیار کر چکی تھی جہاں وہ انیسہ کو خود سے پرے ہٹا کر دیکھنے لگا تھا مگر سارے مرحلوں اور ترشیوں کے باوجود انیسہ ابھی اس مقام پر نہیں پہنچی تھی جہاں وہ اپنے آپ کو نعیم کے بغیر بھی محسوس کرے یا نعیم کو خود سے دور ہٹا کر بھی مطمئن و مسرور زندگی بسر کرے لیکن ایک تبدیلی انیسہ میں بھی تیزی سے رونما ہونے لگی تھی کہ جوں جوں بچہ ننھیال سے زیادہ وابستہ اور مانوس ہوتا جا رہا تھا انیسہ کے اندر مقیم ماں پھر وہ عورت بننے لگی تھی جو صرف اپنی ہی طرف دیکھتی اور اپنے ہی توسط سے ساری دنیا کو پسند یا ناپسند کر سکتی تھی۔ جو اپنی ذات کو درمیان سے ہٹا کر کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔ بچہ تیزی سے بڑھتا رہا مگر انیسہ نے اس کا بڑھنا نہیں محسوس کیا۔ وہ بچے کے بغیر زندگی گزارنے کی عادی ہوتی جا رہی تھی اور اپنی ممتا کی تسکین کے لئے یہ خیال، یہ یقین ہی اُسے کافی تھا کہ بچہ آرام سے ہے۔ اُس جیسی ہی مہربان اور شفیق گودیوں میں محفوظ ہے۔ کالج سے لوٹ کر وہ بچے کو کچھ دیر کے لئے اپنی گود میں ضرور اٹھا لیتی مگر یہ انداز بھی اب ایک میکانکی عمل بن چکا تھا۔ کیونکہ کالج سے لوٹ کر اُسے اکثر کہیں نہ کہیں جانا ضروری ہوتا تھا۔ وہ اپنے سماجی تعلقات بھی خوب مستحکم کرنا چاہتی تھی۔ اپنے ہر ہر پہلو کو تربیت دے کر بے حد مربوط اور استوار کرنے کی خواہش مند تھی تاکہ اُس میں کوئی کمی ایسی باقی نہ رہ جائے جو اسے نعیم کے مقابل پہنچکر پھر ٹھٹکنے یا جھجکنے پر مجبور کر دے بلکہ اب تو ہر ہر محاذ پر وہ نعیم کی شکست کی متمنی تھی اور نعیم کو خود نعیم کی طرف سے

پانا چاہتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ سسرال آنے جانے کے دوران نعیم کی پیاسی نظر رابعہ پر پڑی۔ رابعہ انیسہ کے بعد والی بہن تھی جسے نعیم نے کبھی نظر بھر کر نہ دیکھا تھا۔ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی مگر اب یکایک خصوصی نگاہ سے دیکھنے پر نعیم کو اندازہ ہوا کہ رابعہ کا چہرہ سبیتا جیسا مطلق نہیں۔ کسی رُخ اور پہلو سے نہیں۔ لہٰذا اب نعیم کو یہ چہرہ سبیتا سے بھی اچھا اور بھلا لگا۔ انیسہ سے بھی زیادہ خوب صورت اور دلرُبا۔ اس چہرے کے ترشے ہوئے خد و خال ہم آہنگ موزونیت کے علاوہ بے نیازی کا ایک تاثر بھی اپنے آپ میں رکھتے تھے اور اتنے سرشار تھے کہ اب یہی تاثر اور سرشاری نعیم کو ہر خوبصورتی سے حسین اور پُرکشش محسوس ہونے لگی۔ ہر قلانہ، ذی ہوش جذبے سے زیادہ محبوب۔ تب نعیم نے فوراً دو محاذوں پہ شکست قبول کر لی۔ پہلا محاذ اُس انسان کا تھا جو آئیڈیلس کا انسان تھا اور جسے ہر لمحہ بلندی اور اوج کی فکر پڑی رہتی تھی۔ ہر دقت، آفت، رکاوٹ، کو پھلانگ کر آگے بڑھتے رہنے کی پیہم جستجو جس کی تمنا تھی اور جو یہ سمجھتا تھا کہ آئیڈیلس اپنی استواری اور پابندی کے لئے کچھ نہ کچھ قربانیاں ضرور چاہتے ہیں۔ ضبط و تحمّل کی بے حد آزمائش اور امتحان۔ اور دوسرا انسان وہ سُلجھا ہوا عام انسان تھا جس کے سامنے آئیڈیلس نہیں ہوتے مگر فلسفۂ زندگی، فلسفۂ اخلاق اور فلسفۂ سماج ضرور ہوتا ہے۔ جو تفریح کی خاطر بھی نہ خود کو قربان کرنا پسند کرتا ہے نہ اوروں کی قربانی لینا چاہتا ہے۔ بلکہ ایک مقررہ اور سیدھی زندگی گزار کر خوش بخوشی ختم ہو جاتا ہے مگر نعیم ان دونوں انسانوں میں سے شاید کوئی بھی انسان باقی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ ان دونوں ہی کو اپنے اندر سے نوچ کر پھینک دینا چاہتا تھا۔ پہلی ہی مایوسی کے شدید ردّ عمل نے اُسے اپنی متعین جگہ سے اتنا ہٹا دیا کہ اب اُن نشیبوں کو دیکھنا بھی اسے گوارا نہیں رہا جہاں صفائی ستھرائی نہیں ہوتی جہاں جھاڑ جھنکاڑ اور گھاس پھونس کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جہاں سورج کی کرنوں سے محروم غلاظت [خلوت]

سے پٹی اندھی بہری گونگی گہرائیاں ہوتی ہیں۔ لیکن نعیم کو شاید اب اخلاق اور اچھائیوں کی اتنی پرواہ نہیں رہ گئی تھی جتنی اپنی خواہشات کے پہلے پہلے مرحلوں پر تھی۔ چنانچہ اُس نے فوراً اپنی توجہ رابعہ کی طرف منتقل کر دی اور اُس کی رغبت حاصل کرنے کا بے حد جویا ہو گیا۔

رابعہ نے اس سے پہلے کبھی ایسی توجہ محسوس نہیں کی تھی۔ وہ ایسی توجہ کے مفہوم ہی سے نابلد تھی۔ وہ صرف ماں باپ بہنوں اور سہیلیوں کی طرف ہی دیکھتی آئی تھی۔ اُسے کسی اور فرد کی جانب دیکھنا آیا ہی نہ تھا۔ وہ کھیل کود کی شوقین تھی۔ اُسے کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ نصابی کتابیں بھی بڑی مجبوری اور جبر سے پڑھا کرتی تھی۔ وہ بے حد کھلنڈری، دُور اندیشی کے قرینوں سے قطعی ناواقف تھی۔ زندگی سے کہیں خوفزدہ نہیں تھی۔ بلکہ زندگی کو ایک پیاری دلاری گڑیا کی طرح بالکل اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے بے حد مگن اور مسرور تھی۔ اسرارِ زندگی اور سحرِ علم سے بے پرواہ، سنجیدگی سے کوسوں دُور، وہ تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کیوں پیدا ہوئی ہے؟ کیسے پیدا ہوئی ہے؟ کس کس طرح زندگی کا بار اُسے اُٹھانا ہے؟ بلکہ گھریلو چارٹ میں جو بھی اس کے لئے لکھا گیا وہ بالکل ویسی ہی زندگی، بلا پس و پیش گزارنے لگی۔ اُس کی شخصیت کی ساری تربیت، تنظیم قطعی اپنے والدین کے زیر اثر تھی اور اپنے گھریلو قاعدوں اور طور طریقوں سے انحراف، انکار رابعہ کے بس میں ہی نہ تھا۔ وہ ہنس مکھ، مطیع فرمانبردار تھی اور جنسِ مخالف کی محبت کے مفہوم سے یکسر غافل، ایسے میں یکایک نعیم نے پسندیدگی کی خاص اور والہانہ نظر سے اُسے دیکھا تو رابعہ کو یہ نظر بڑی انوکھی عجیب معلوم ہوئی۔ یہ نظر کیسی ہے؟ اُس سے کیا کہتی ہے؟ کیا پوچھنا چاہتی ہے یہ رابعہ کو نہیں معلوم تھا۔ نہ اُس نے کھوجنا ہی چاہا۔ تاہم یہ نظر رابعہ کو بھا گئی۔ اسے خود بھی پُرکشش محسوس ہونے لگی۔ وہ سادہ لوحی سے نعیم کے اطراف گھومنے لگی۔

انیسہ نے رابعہ کی اس حرکت کو شک کی نظر سے نہیں دیکھا۔ مگر رابعہ کی ماں نے رابعہ کو ضرور ڈانٹ پھٹکار دیا۔ رابعہ سہم گئی۔ نعیم کی نظر اور التفات میں بھی چوکنا پن پیدا ہوگیا۔ نعیم نے رابعہ کو سمجھایا۔ احتیاط کرو رابعہ۔ احتیاط کیا کرو۔

"احتیاط!" رابعہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں تم بہت اونچی آواز میں ہنستی ہو"

"تو کیا ہنسنا گناہ ہے؟"

"گناہ نہیں مگر بزرگوں کی موجودگی میں سنجیدہ رہنا چاہیے"

"اور جب بزرگوں کی موجودگی میں ہنسی آئے تب؟"

"تب صرف مسکرا لینے پر اکتفا کر لینا چاہیے"

"مگر پہلے تو امی نے مجھے کبھی نہیں روکا بلکہ وہ تو سب کو کہا کرتی ہیں۔ ہنسو، بولو، خوش رہا کرو"

"پہلے کی بات دوسری تھی۔ اب میں ایک نیا فرد جو گھر میں آگیا ہوں"

"شاید —" رابعہ نے معصومیت سے کہا اور بولی: "آپ بات بڑی آسانی سے سمجھا دیتے ہیں اگر میری ساری استادنیاں بھی ایسی ہی ہوتیں تو شاید پڑھنا مجھے اتنا مشکل محسوس نہ ہوتا۔ مگر وہ سب تو ہمیشہ فقط سوال ہی کیا کرتی ہیں۔ یہ نہیں کہ خود بھی کچھ بتا دیں"

"تو کیا تمہیں واقعی کچھ خبر نہیں رابعہ کہ سب کیا ہے اور کیوں؟ فرق اور فاصلے، باتوں کی ضروری جان پہچان...؟"

"چھوڑیئے۔ اب آپ بھی بور کرنا چاہتے ہیں شاید۔ آخر ایسی عجیب بات ہی کونسی ہے جو ہر انسان ضرور ہی اس سے واقفیت حاصل کرے" وہ نادانستہ اپنے گندھے ہوئے بالوں سے کھیلنے لگی پھر جھٹک کر بولی:

"مجھ سے تو بس کھیل کی بات کیجئے۔ مجھے طرح طرح کے کھیل آتے ہیں۔ ایک سے ایک پُر لطف اور دلچسپ۔ میں تو زندگی بھر صرف کھیلتے ہی رہنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن میں کسی کھیل سے واقف نہیں رابعہ۔" نعیم نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں نے اپنے بچپن میں کبھی کوئی کھیل نہیں کھیلا۔ بس پڑھتا رہا۔ پڑھتا رہا۔" وہ رابعہ کی روشن آنکھوں میں عجیب انداز سے جھانکنے لگا۔

"تو آپ بچے بنے بغیر ہی بڑے بن گئے؟" رابعہ بڑے شک سے اُسے دیکھنے لگی "مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں یقین نہیں کر سکتی۔"

"لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں کبھی بچہ نہیں رہا۔ میں ہمیشہ کتابوں کے گرد گھومتا رہا۔ ناسمجھی میں بھی اُن کے آس پاس نزدیک رہا جیسے میں کتابوں کے اوراق سے ہی بنایا گیا ہوں۔ کتابیں ہی میرا کھیل کود تھیں۔ کتابیں ہی میری تلاش اور کتابوں نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا۔"

رابعہ نے حیرانی سے نعیم کو گھورا پھر مدھم لہجے میں بولی: "حالانکہ کتابیں کبھی میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ کتابوں نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ مجھے کچھ نہیں سمجھایا۔ ایک بار انیسہ آپا نے کہانیوں کی کچھ کتابیں بھی مجھے پڑھنے کو دی تھیں مگر مجھے وہ بھی پسند نہیں آئیں۔ اُن میں ایسے انوکھے انسانوں کا ذکر تھا جنہیں میں نے آج تک نہیں دیکھا بھلا بتائیے تو شہزادے، پریاں، دیو کہاں ہیں۔ مجھے تو کبھی نظر نہیں آئے۔"

نعیم بے ساختہ مسکرا دیا۔

"اچھا اگر پریاں تمہارے جیسی ہوتی ہوں رابعہ تو ۔ ۔ ۔ ؟"

"میرے جیسی ؟" رابعہ نے لپک کر آئینہ اُٹھا لیا اور خود کو بغور دیکھنے کے بعد اطمینان سے بولی۔ "اوں ہوں! اول تو میں اتنی خوب صورت نہیں جتنی پریاں بتائی جاتی ہیں۔ دوم میری خواطر کبھی کوئی شہزادی نہیں ہوا جیسا کہ پریوں

کے لئے شہزادوں اور دیوؤں میں ہوا کرتا ہے۔"

"پھر بھی یقین کرو رابعہ کہ تم پری ہو۔ پریاں خوبصورت عورتیں ہی ہوتی ہیں۔"

"اچھا!"

"اور کیا؟" نعیم نے کہا "کہانی قصوں کو تو اس ڈھنگ سے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ذرا دلچسپ ہو جائیں ورنہ پریاں خوبصورت عورتیں ہی ہوتی ہیں۔"

رابعہ لپک کر وہاں سے بھاگی اور فوراً انیسہ کے پاس جا پہنچی۔ "آج سے میں پری ہوں۔" اُس نے اِٹھلا کر شان سے اطلاع دی اور مسکرانے لگی۔

"کیا... ؟" انیسہ نے کتاب ہاتھ سے رکھ دی اور بوکھلا کر رابعہ کو دیکھا۔

بازو والے کمرہ سے امی نے آواز دے کر رابعہ کو طلب کیا اور اُس کے دو تھپڑ لگائے۔ "خبردار جو ایسی بے سروپا باتیں پھر کیں تو۔"

رابعہ دیر تک بستر پر پڑی آنسو بہاتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کس کو صحیح سمجھے، امی کو یا نعیم کو!! پیار و محبت کے باوجود کبھی کبھی امی بغیر کچھ سمجھائے اُسے جھڑک دیا کرتی تھیں۔ مار بھی دیتی تھیں مگر نعیم نے کبھی ایسی سخت حرکت نہیں کی تھی بلکہ وہ تو باتوں کو سمجھاتا بھی تھا۔ لہذا اپنی سوچ کے اِس موڑ پر وہ لامحالہ نعیم کی طرف جھکنے لگی اور تب یہ بات رابعہ کے دماغ میں جم کر بیٹھ گئی کہ نعیم سے کی گئی باتیں اُسے کسی اور کے سامنے نہیں دوہرانا چاہیئے۔

لہذا آنسو بہا لینے کے بعد موقع ملتے ہی رابعہ نے نعیم سے کہا:

"امی بہت ناراض ہیں۔ انہیں میرا پری ہونا پسند نہیں۔"

"مگر تم نے امی سے کیوں کہا۔ کیا سب باتیں امی سے کہنے کی ہوتی ہیں؟"

پگلی لڑکی میں نے کہا نہیں تھا اعتیاط کرو۔ میرا ب ہنس دو۔" اُس نے رابعہ کی ٹھوڑی تھام کر اُس کا چہرہ اپنے سامنے کیا اور نرمی سے بولا: "ہنسو، ہنس ڈالو۔ جب تم ہنستی ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شیشے آپس میں ٹکرا رہے ہوں۔ جیسے پھوار چھما چھم برس رہی ہو۔ جیسے موتی کھنک رہے ہوں۔ کیا تم نے اپنی ہنسی کبھی سُنی ہے رابعہ؟"

رابعہ کی آنکھیں تارا بن کر نسیم کے چہرے پر جم گئیں۔ اوہ! کیسی انوکھی پیاری باتیں ـــــ پھر وہ مسحور اور بے خود ہونے لگی۔ "آپ نے اتنی اچھی باتیں کہاں سے سیکھیں نسیم بھائی! یقیناً کتابوں سے نا؟ کیونکہ کتابیں نہ پڑھنے والے تو شاید ایسی باتیں کر ہی نہیں سکتے۔ سچ مچ کسی نے آج تک مجھ سے ایسی باتیں نہیں کیں اور آپ کی باتیں سُن سُن کر اب میرا بھی جی چاہنے لگا ہے کہ فوراً کتابیں پڑھنا شروع کر دوں۔"

"میں خود ہی تمہیں سب سکھا دوں گا۔ کتابوں کی کیا ضرورت ہے۔" نسیم مسکرایا۔

"ٹھیک ہے۔" رابعہ نے مان لیا۔ "اور سُنیے" اُس نے انتہائی رازداری سے کہا: "امی کو پتہ نہ چلے، ورنہ وہ پھر مجھ پر خفا ہونگی میں اُنہیں خفا کرنا بھی نہیں چاہتی۔"

رابعہ لوٹ گئی اور ایک علانیہ مسکراہٹ نسیم کے سراپا کو منور کر گئی۔

ہاں آج سے ہم راز دار ہیں۔ ہم میں ہونے والی ہر بات راز ہی رہے تو اچھا ہے۔ اُس نے خود سے کہا اور مسرور ہونے لگا۔

نسیم کے پاس سے لوٹ کر رابعہ دیر تک تصور میں پاس پاس کھڑے نسیم اور اپنے کو نظر بھر کر دیکھتی رہی۔ اس کا جی چاہا وہ بھی نسیم کے بازو کھڑی ہو جائے اور اور پھر یہ مسرت اُس کی ساری زندگی بن جائے۔ مرد کا اب تک اس کے پاس کوئی تصور نہیں تھا۔ مگر نسیم کی قربت میں اب وہ مرد سے روشناس ہو رہی تھی۔ ایک نئے تصور سے واقف ہونے لگی تھی۔ اس کے کھلنڈرے پن میں ایک نیا احساس تیز

دھارے کی طرح شامل ہو رہا تھا اور اُس کی تیزی، روانی اُسے مزید ہیجان کر رہی تھی۔ بے حد مضطرب ـــــ جب نعیم کی انگلیاں اُس کی ٹھوڑی سے چھوئی تھیں تو ایک عجیب سنسنی اُس کے تمام جسم میں پھیل گئی تھی اور جب نعیم نے ہاتھ ہٹا لیا تھا تو سنسناہٹ خود بخود ختم ہو گئی تھی۔

رابعہ نے بالکل نعیم کے انداز میں خود اپنی ٹھوڑی کو آہستگی اور احتیاط سے چھوا مگر کوئی لہر اُس کے جسم میں نہیں پیدا ہوئی۔ رابعہ کا کل وجود خاموش اور سرد رہا۔ اُس نے اپنا ہاتھ بے کیفی سے ہٹا لیا اور ڈوپٹے کو انگلیوں پر لپیٹتی کھولتی سوچنے لگی ۔ تو کیا سارا کرشمہ نعیم بھائی کی انگلیوں کا تھا ـــــ ؟ تب اس کا چہرا تیزی سے رنگ پکڑنے لگا۔

جب انیسہ نے اُسے دیکھا تو چونک کر سوچا۔ رابعہ کے چہرے پر یکایک ایک کیفیت کیوں جاگ گئی ہے ۔ اس سے پہلے تو رابعہ کا چہرہ کبھی ایسا نہیں تھا۔ دل آویز ہوتے ہوئے بھی ایسا نہیں مگر اب تو معلوم ہوتا ہے جیسے رابعہ کے چہرے پر شہد مل دیا گیا ہو۔ اُس کے ایک ایک نقش کو شہد پلایا گیا، شہد سے لوت دیا گیا ہو جیسے یہ چہرہ از سر نو شہد سے گڑھ دیا گیا ہو۔ یہ مٹھاس یہ شیرینی یہ صبح دم جاگنے کی سی نرم نرم کیفیت، یہ حلاوت یکایک کہاں سے آ گئی۔ بار بار وہ رابعہ کو گھورتی اور یہی بات سوچتی رہی لیکن رابعہ کو اپنے چہرے کے بدل جانے کا مطلق کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ خاص کیفیتوں سے گزرتے ہوئے بھی ان کے ردِّ عمل سے ناواقف تھی۔ مگر جس روز دوبارہ تنہائی پا کر نعیم نے زیادہ انوکھی اچھوتی نظر سے اُس کی طرف دیکھا تب رابعہ بھی چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ یکایک اُسے اپنے چہرے پر ایک آفتاب کے سلگنے ایک مہتاب کے جگمگانے، ہزاروں ستاروں کے ٹپ ٹپ پڑنے کا قطعی احساس ہوا۔

اور وہ پہلی بار لجا کر سمٹ کر بولی: "ایک بات بتائیے نعیم بھائی!"

"کونسی بات ــــ؟"

"کیا چاند تارے، سورج کبھی آسمان سے زمین پر بھی اُتر سکتے ہیں؟"

"ہاں" نعیم بولا "اگر انہیں دیکھنا چاہتی ہو تو ایک دوشیزہ کے چہرہ پر دیکھو۔ اُس کی آنکھوں، اُس کے تبسّم، اُس کے شباب میں دیکھو۔"

"شباب کیا ہوتا ہے نعیم بھائی؟"

"شباب ہی تو عورت کا حسن ہوتا ہے رابعہ۔"

رابعہ کی نظر بے ساختہ اپنے وجود پر مچلی۔ اُس کے سینے میں کوئی چیز تیز خرامی سے تڑپنے لگی۔ "مگر مجھے تو اپنے میں کہیں شباب نظر نہیں آتا۔"

"شباب تمہارے اندر ہے۔ تم میں چھپا ہوا۔ محصور۔"

"مجھ میں چھپا ہوا؟"

"ہاں ــــ"

پھر رابعہ دنوں خود کو ٹٹولتی رہی۔ کہیں شباب کپڑوں میں نہ اُلجھ گیا ہو۔ کہیں ڈوپٹے کی تہوں میں نہ چھپ گیا ہو۔ تب غسلخانہ میں دیر تک رہنے میں اُسے لطف آنے لگا۔ اگرچہ کہ شباب اُسے وہاں بھی نہیں ملا مگر پانی کے ٹب میں بے پر بے غوطے لگاتے ہوئے یا شاور کی تیزی کو اپنے برہنہ جسم پر محسوس کرتے ہوئے اُسے نعیم کا لمس، اُس لمس کی حدّت، سنسناہٹ طمانیت محسوس ہونے لگی۔ تب اُس نے فیصلہ کر لیا کہ نعیم سے شباب کا ٹھیک ٹھیک اتا پتہ ضرور پوچھ کر رہے گی۔ اور اُس نے پوچھ بھی لیا۔

"آپ کی سب باتیں میری سمجھ میں آگئیں لیکن صرف ایک بات ـ..."

نعیم نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"مجھے تو ڈھونڈنے پر بھی اب تک شباب نہیں ملا" رابعہ اٹھلائی۔ نعیم ہنس پڑا۔ "پگلی پگلی!!" اس بار نعیم نے بے اختیار رابعہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ خود

سے اتنا قریب کر لیا کہ رابعہ کا بدن بجلی کی مار میں آئے ہوئے گھانس کے گٹھے کی طرح سلگ اُٹھا۔ پھر اس سے قبل کہ رابعہ ہلنے بھی کر سکتی نعیم جھکا اور اُس نے اپنے تپاں ہونٹ ایک وحشت و دیوانگی کے ساتھ رابعہ کے ہونٹوں سے پیوست کر ڈالے۔

خون رابعہ کی ہر ہر رگ میں اچھل کر، مچل کر، تڑپ کر صرف اُس کے ہونٹ بن گیا۔ رابعہ کا تمام وجود تیزی سے فقط اُس کے ہونٹوں میں ڈھلنے لگا۔ ہاتھ پاؤں، آنکھ، ناک، کان حتیٰ کہ سارا جسم فقط ہونٹ بن گئے اور عین اُس وقت جب کافی دیر بعد نعیم اُس کے ہونٹ چھوڑ کر ہٹنے لگا رابعہ یکلخت مچل کر دوبارہ نعیم کے ہونٹوں سے چپک گئی اور پھر چار ہونٹ اتنی دیر تک آپس میں گتھے ہوئے، جڑے ہوئے، پیوست رہے کہ اتنے ہی عرصے میں رابعہ اپنا سارا لڑکپن پھلانگ کر عورت بن جانے کے لئے آگاہ و آمادہ و بے قرار ہو گئی۔ وہ اپنا سوال بھول گئی اُسے فقط جواب یاد رہ گیا۔

جواب جو اُس کے سارے اندرون میں آگ سی لگا چکا تھا۔ انگیٹھی اور بھٹی کی طرح سلگ اُٹھا تھا۔ اس آگ میں ایک معصوم لڑکی کا سارا اثاثہ بلا کم و کاست دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ مگر لڑکی سمجھ نہیں رہی تھی کہ وہ خاک اور خون میں تھڑنے لگی ہے جھلس کر مسخ ہو رہی ہے۔ وہ اپنا اچھوتا پن کھونے لگی ہے۔ اپنی قیمت گنوا رہی ہے۔ وہ تو خوش تھی اور مسحور۔

اُس رات رابعہ سو نہ سکی۔ نیند اُس کی آنکھوں سے اُڑ گئی اور نیند کی جگہ بے پناہ سوالات اُس کے ذہن میں جگہ بنانے لگے۔ وہ ایک نامعلوم کشش میں اسیر تھی۔ اور مختلف جوابات رفتہ رفتہ اُس کی ناسمجھی کے آگے آ آ کر رک رہے تھے۔ یہ سوال و جواب صحیح تھے یا غلط۔ قبل از وقت تھے یا بر محل مگر رابعہ کے ذہن میں راہ پا چکے تھے اور اب رابعہ اُن ساری راتوں کو اپنے سامنے عیاں دیکھ رہی تھی جب کمروں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور مرد عورت آپس میں گتھ کر راز بن جاتے ہیں۔ وہ لبستر پر

بے اختیار کروٹیں بدلنے لگی۔ بے خوابی اُس کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح کھٹکنے لگی۔
وہ بار بار اِن کانٹوں کو نکال کر اپنی آنکھیں سکون سے بند کر لینا چاہتی مگر ایک شدید
خواہش تیرتے ہوئے خوشنما ہنس کی طرح رہ رہ کے اُس کی طلب کے سمندر میں
اُبھر آتی اور اُس سے کہتی۔ آؤ میرے ساتھ تیرو۔ انیسہ کو نعیم کے بازو سے ہٹنا
دو۔ انیسہ کی جگہ خود لے لو۔ انیسہ مدتوں سے شباب کا مزہ لوٹ رہی ہے اور
اب تمہاری باری ہے۔ تم بھی یہ لذّت چکھو۔ اپنے حُسن کو سمجھو دیکھو تب دن کی روشنی
میں بھی نعیم اُسے اپنے اوپر جُھکا ہوا نظر آنے لگا اور اس کیفیت تلے رابعہ کا جسم
ساز کی طرح سدا جھنجھنایا جانے لگا اور اس بڑھتی ہوئی جستجو نے رابعہ کو غیر محسوس
طور پر چور بنا دیا۔ سب کے سو جانے کے بعد رابعہ خود کو شال میں اچھی طرح لپیٹ
کر انیسہ کے دروازے سے جا لگتی اور دروازے کی جھری میں سے جھانک جھانک
کر کمرے کے اندر ہونے والے واقعات کی ٹوہ لینے لگتی۔ کئی دن گزر گئے مگر اُس
نے کبھی نعیم کو انیسہ پر جھکا ہوا نہیں پایا۔ دونوں اپنی اپنی چارپائیوں پر گٹھری بنے علیحدہ
علیحدہ پڑے رہتے اور رابعہ حیران ہوتی۔ اُسے ایک نامعلوم سکون حاصل ہوتا اور
وہ سوچتی شاید انیسہ آپا میں شباب نہیں ہے۔ عورت کا حُسن نہیں ہے۔ تبھی تو
نعیم بھائی اُن کے ساتھ اس طرح پیش نہیں آتے جس طرح شباب کے ساتھ
پیش آیا جا سکتا ہے۔ پھر روشن دنوں میں وہ انیسہ کو مستقل تکنے لگی اور رابعہ
کی اس حرکت سے انیسہ کچھ زیادہ ہی سراسیمہ اور پریشان ہونے لگی۔ "بات کیا ہے
تم مجھے اس طرح تکنے کیوں لگی ہو رابعہ؟" بالآخر اُس نے ایک دن پوچھ ہی لیا۔
ساری بات فوراً رابعہ کی زبان پہ آتے آتے رہ گئی مگر اُس نے یکلخت خود
کو سنبھالا اور رازداری کا معاہدہ یاد آتے ہی سب کچھ حلق میں گھونٹ لیا پھر بڑی
ہوشیاری اور مہارت سے ہنس پڑی۔ "میں یہ محسوس کرنا چاہتی ہوں انیسہ آپا

کہ ہم دونوں کچھ ملتے جُلتے بھی ہیں یا نہیں ؟"

"بے وقوف ؟" انیسہ مسکرائی ۔ "اس کے لئے اتنا گھورنے کی کیا ضرورت ہے ۔ ہم دونوں بہنیں ہیں ۔ الگ الگ ہو کر بھی ہم میں مشابہت تو ضرور ہوگی ہی ۔"

" ٹھیک ہے لیکن . . . ."

" لیکن ویکن کچھ نہیں ۔ خود اُلجھ کر دوسروں کو اُلجھایا مت کرو ۔ پتہ ہے پچھلے کئی دنوں سے امی تمہارے متعلق کتنی فکر مند ہیں ؟"

"میرے متعلق ۔ مگر کیوں ؟ کیا فکر ہے امی کو ؟"

"صرف امی ہی نہیں میں بھی تو یہ سوچنے لگی ہوں کہ تم کچھ بدلی بدلی سی کیوں نظر آنے لگی ہو ۔ تم میں یہ کیسی تبدیلی ہو رہی ہے اچانک ؟"

"میں عورت بن رہی ہوں شاید ؟" رابعہ نے بڑے سکون سے کہا اور نہایت فخر کا مظاہرہ کرنے لگی ۔

انیسہ چونک گئی ۔ اُس نے بغور رابعہ کو دیکھا ۔ رابعہ کے الفاظ ، اُس کا انداز انیسہ کے تمام وجود میں بادلوں کی طرح گرجنے گونجنے اُسے بوکھلانے لگا ۔

اور اُس رات انیسہ کو بھی نیند نہیں آئی ۔ دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد اُسے بند دروازے کی دراز سے کوئی جھانکتا ہوا نظر آیا ۔ انیسہ سٹپٹا کر لحاف میں دبک گئی ۔ اُس نے نعیم کو جگانا چاہا پھر کچھ سوچ کر وہ خود اُٹھی اور ملحقہ باتھ روم سے گزر کر باہر جھانکنے لگی ۔ کمرے کی چوکھٹ پر شال میں لپٹا ہوا کوئی ٹھہرا ہوا تھا ۔ ہمت کر کے انیسہ دبے قدموں آگے بڑھی اور دفعتاً اُس نے رابعہ کو پہچان لیا ۔ غصہ ، کوفت اور شرمندگی سے انیسہ کانپنے لگی ۔ اُس کا جی چاہا چوٹی سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی بے شرم رابعہ کو امی کے پاس لے جائے اور ایسی بے ہودہ جسارت کا جی بھر مزہ چکھوائے مگر ضبط کر کے وہ بے آواز پلٹی ۔ پھر تو نیند

اُس کی آنکھوں میں اور سانسوں میں بالکل چھری بن گئی۔ رہ رہ کے اُس کے احساس اور سکون کو کاٹنے لگی۔ حیرت کا ایک آتش فشاں اُس کے اندر پھوٹ پڑا۔ کرب کے دھماکوں سے اُس کا تمام وجود ہچکولے کھانے لگا جیسے مضبوط پیڑ کے ساتھ بندھی ہوئی رسّی اپنے ہر جھٹکے کے ساتھ تناور پیڑ کو بھی ہلائے ڈالتی ہو۔ رابعہ جیسی لڑکی سے یہ کس طرح ممکن ہے۔ وہ دیر تک متعجب ہوتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ ایک شک ایک شبہ زمین سے پھوٹتی کونپل کی طرح اُس کے ذہن کی پرتیں چاک کرکے اپنا سر اُبھارنے لگا۔ پہلے تو نعیم اصرار پر بھی دیر تک اپنے سسرال میں ٹھہرا نہ کرتا تھا مگر آجکل وہ زیادہ سے زیادہ وقت یہیں کیوں گزار رہا ہے۔ راتوں کو بھی بخوشی رکنے لگا ہے۔ حالانکہ پہلے پہل صرف چند گھنٹوں کے لئے آکر پھر فوراً ہی رخصت ہو جاتا تھا۔

انیسہ تڑپ کر تلملا کر رہ گئی۔ اُس کی پڑھائی میں حرج ہونے لگا۔ اور بالآخر ایک شام اپنے پوشیدہ تعاقب کے نتیجے میں اُس نے رابعہ اور نعیم کو راز و نیاز میں مصروف اکٹھے دیکھ ہی لیا۔ وہ اپنی چیخ کو روکنے کے لئے سرپٹ وہاں سے بھاگی اور اُس دلآویز بدبختانہ لمحے کے دیدار کے بعد انیسہ کا ہر خوف ہر ہر جذبہ ایک خفیہ تلوار بن گیا جس سے نعیم اور رابعہ کو کاٹنے وہ زیادہ سے زیادہ بے قرار رہنے لگی۔ پھر بہت سوچ سوچ کر اُس نے تمام بات اپنی ماں کو من وعن بتا دی۔ ایسی بات کہتے ہوئے وہ خود شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ لیکن وہ اپنی ماں کی مدد کے بغیر کچھ نہ کر سکتی تھی۔ اپنا غم کسی اور سے بیان نہ کر سکتی تھی۔

دوسرے حالات میں ایسی بات جان کر اُس کی ماں نہ جانے کیا کچھ کر ڈالتیں۔ مگر نعیم کے سلسلہ میں اپنی نازک پوزیشن کا لحاظ کرکے اور انیسہ کی عزت، خود اپنی حرمت اور اُس نادان لڑکی کے وقار کی خاطر جو عزت، حرمت اور وقار کے

مفہوم سے بھی واقف نہیں تھی۔ انہوں نے پوری خاموشی سے ایک پردے کی طرح خود کو پھیلا لیا۔ پردا جو پردا پوشی کرتا ہے۔ کسی کو یہ خبر نہیں ہونے دیتا کہ اُس کے پیچھے اوٹ اور او جھل میں کیا ہے۔ سچا ہوا یا وہم برہم تب انہوں نے یہی پردا پوری خاموشی اور دانشمندی سے انیسہ اور رابعہ کی زندگیوں پر ڈال دیا۔ انیسہ کو واپس اپنے سسرال چلے جانے کا مشورہ دیا۔

اگلے ہی روز انیسہ لوٹ گئی۔ واپسی کے اس اچانک فیصلہ پر نعیم نے حیرت کا اظہار ضرور کیا مگر وہ خود بھی خاموشی سے اس مرحلے سے گزر گیا۔

سسرال لوٹ کر انیسہ کا کھویا ہوا قرار کچھ حد تک ضرور اُسے مل گیا مگر اب اُس کی اکتاہٹ اور بے چینی میں ایک مستقل اضافہ ہو گیا۔ نعیم اُس سے بہت دُور ہو گیا۔ وہ خود نعیم سے بہت دُور ہو گئی۔ نعیم جو کبھی اُس کا قرار اور بانکا خیال تھا اب ایک دہکتی ہوئی سلاخ بن کر اُسے مستقل داغنے لگا۔ وہ کُڑھنا، رونا نہیں چاہتی تھی مگر آنسو بن بلائے مہمانوں کی طرح خود اُس کی ذات میں تانا باندھنے لگے اور اُسے جھنجھوڑ، جھنجھوڑ کر کہنے لگے: ہمارا استقبال کرو، ہمیں خوش آمدید کہو۔ اُسے اپنے آنسوؤں سے بھی جھلاہٹ محسوس ہوئی۔ وہ کیوں بہتے ہیں کس کے لئے رہتے۔ نعیم نے نہ صرف خود کو گنوایا بلکہ اُس کا مستقبل بھی تاریک و کربناک کر دیا۔ تب انیسہ نے سوچا کہیں اُس کے یہ آنسو رابعہ کے لئے تو نہیں۔ رابعہ جو اُس کی پیاری بہن ہے مگر اب ایک دشمن کی طرح اُس کے مقابل آکھڑی ہوتی ہے۔ کاش کہ رابعہ ان آنسوؤں کے کرب۔ ان کی شدتِ تکلیف کو صحیح معنوں میں جان سکتی۔ لیکن انیسہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ آخر رابعہ دشمن کس طرح بن گئی۔ کس نے اس میں دشمن بننے کی صلاحیت پیدا کی۔ وہ جو سادہ لوحی کے سوا کسی بات سے واقف نہ تھی دھوکے فریب جعلسازی سے

کس طرح واقف ہوگئی۔

خیالات خونی خنجروں کی طرح انیسہ کے ٹکڑے اُڑاتے رہے اور تنہائی اور ویرانی کا، بربادی کا گرد و غبار تہہ بہ تہہ اُس پر جم کر دبیز ہوتا گیا۔ بی۔ اے کا امتحان سر پر تھا اور اُس کا دوسرا بچہ بھی جو چند ماہ پیشتر اپنی ننھیال میں ولادت پا چکا تھا اب اُس کے لئے بلائے جان ثابت ہونے لگا تھا۔ وہ بچوں کی خبر گیری اور نگہداشت کی عادی نہ رہی تھی اور اب اُس کا پیار بھی مختلف انداز اختیار کر چکا تھا۔ جب کبھی وہ یہ سوچتی کہ اِن بچوں کا باپ نعیم ہے تو اُسے بچوں سے بھی دوری اور حقارت کا احساس ہونے لگتا۔ کاش یہ اُس کے بچے نہ ہوتے یا نعیم ان کا باپ نہ ہوتا۔ کاش کہ اُسے بچے ہوتے ہی نہیں۔ وہ اکیلی ہی ہوتی تب چھٹکارا یا مقابلہ کتنا آسان ہو جاتا مگر اب تو اِن بچوں کی خاطر اُسے مستقل ایک آزار برداشت کرنا تھا۔ مستقل مصالحت سے گزرنا تھا۔ دلدل کو دلدل سمجھتے ہوئے بھی اُس میں اُترنا، دھنسے رہنا تھا۔ ہائے کیا وہ یہ سب کچھ برداشت کرنے کے لئے ہی اِتنی آسان زندگی گزار کر آئی تھی۔ عشرت و طرب کی قیمتی زندگی۔ کیا اُس نے اپنا کنوارا پن اس لئے نعیم کے حوالے کیا تھا کہ وہ اس کی ہر شاخ اور پتہ توڑ کر اسے محض ایک ٹھنڈ بنا دے۔ اُس کے ماں باپ نے اسے کتنے جتن سے رکھا تھا۔ جیسے کوئی اپنے باغیچے کے پھولوں کو رکھتا ہے مگر نعیم نے تو دیکھتے ہی دیکھتے سب تہس نہس کر دیا۔ وہ تو کچھ بھی برداشت کرنے کی عادی نہیں تھی مگر اب کتنا کچھ برداشت کرنے پر مجبور ہے۔ زندگی کی عدم سہولتیں، بوجھ، گرانباریاں، غار نما زندگی جو منہ پھاڑے اس کے روبرو ہے۔ جو اس کا سارا ہموار اور اگلا راستہ روکے ہوئے ہے۔ وہ کیا کرے۔ کس سے مدد مانگے۔ کیسے اپنے بچاؤ کی کوئی راہ ڈھونڈے۔ ساری پناہ گاہیں مسدود ہیں۔ سب کچھ ایک کھوٹے سکے

کی طرح اپنی قسمت اور وقعت کھو چکا ہے۔

وہ روتی رہی، روتی رہی اور دو دو بچوں کی موجودگی کے باوجود دن بدن اس کا اکیلا پن بڑھتا رہا۔ ویرانی اور سناٹا گہرا ہوتا۔ اس پر ہنستا، اس سے پوچھتا رہا۔ اب بچ کر کہاں جاؤ گی۔ کہاں؟

اس نے چاہا ہر بات بھول جائے مگر بھول بھی نہ سکی۔ جب بچے روتے تبھی وہ ان کی طرف متوجہ ہوتی ورنہ اپنے ہی دکھ میں اپنی ہی جلن میں اسیر خود کو ڈھونڈتی تلاش کرتی رہتی۔ اپنے کجلائے ہوئے رخ کے لئے تھوڑی سی روشنی تھوڑی تابنا کی کھوجتی رہتی۔ اس کا ٹوٹا ہوا دل پھر ترقی و تعلیم سے بھی اچٹ گیا۔ اب وہ کیوں پڑھے؟ کیوں آگے بڑھے؟ جب نعیم کو جیتنا اپنانا نہیں ہے تو یہ مزید آزمائش یہ تمام گورکھ دھندا کس لئے؟ صرف دنیا کے لئے تو اس نے اپنے آپ کو اسقدر بدلنا نہیں چاہا تھا۔ انیسہ نے کتابیں پھر ایک دوسرے پر ڈھیر کر دیں اور خود کو بالکل مایوسی کی نذر کر دیا۔

نعیم کا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ وہ انیسہ میں دلچسپی لے مگر اسے اپنی بیوی کا ادھورا کہلایا جانا پسند نہ تھا۔ انیسہ سے اس کی وابستگی خواہ کیسی بھی سہی مگر وہ یہ نہیں بھول سکتا تھا کہ وہ بہر حال اس کی بیوی کہلاتی ہے۔ دنیا کے لئے ان کا رشتہ اٹل ہے لہٰذا پھر یہ رشتہ ہی اس کی توجہ اس کی ذمہ داری اس کا پاس و لحاظ بنا۔ اس نے جوں توں انیسہ سے بی۔ اے کا امتحان دلوا دیا۔ انیسہ نے امتحان دے دیا۔ مگر وہ کسی خوش آیند نتیجے کی منتظر نہیں تھی۔ زندگی کے اس دوسرے دور میں وہ شدت سے جسمانی اور ذہنی فاقوں میں مبتلا تھی۔ تیزی سے اس بے حسی کی طرف جا رہی تھی جہاں محبت اور ملائمت کا ہر ہر نرم و نازک حساس جذبہ اپنی موت آپ مرنے لگتا ہے اور جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہ محض

نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ نعیم بھی گھر اور گھر کے کاروبار سے زیادہ غافل ہو گیا تھا۔ خدا جانے کہاں کس طرح معروف رہتا تھا۔ البتہ مائیکے سے ہر دوسرے تیسرے روز انیسہ کی کھدائی ضرور خیریت عافیت دریافت کرنے آجاتی۔ اپنے ساتھ انیسہ کی ماں کا بھجوایا ہوا اناج لاتی، گھی کے کنستر لاتی، رقم لاتی، انیسہ کا ذہن بٹاتی، گھر کے کام کاج میں اُس کا ہاتھ بٹاتی۔ اُس کی تنہائی پر اخلاص کے نرم پھاہے رکھتی۔ اُمید کے نئے راستے، نئے طریقے، نئے راز بتاتی۔ ایسے گر جو انیسہ کے مزاج میں ضبط و تحمل اور زیادہ قوت برداشت پیدا کر سکیں۔ مگر جب وہ چلی جاتی تو انیسہ پھر خود کو بے گھر اور خانماں خراب محسوس کرنے لگتی۔ پھر گرہستی سے بیزار، زندگی سے خوفزدہ، اُکھڑی اُکھڑی سی ہو جاتی۔ کیونکہ انیسہ جانتی تھی کہ کسی درخت کے پھول پتے ٹہنیاں سب ٹوٹ بھی جائیں تو بچا ہوا درخت پھر بھی کسی نہ کسی طرح قوت نمو حاصل کر کے دوبارہ پھل پھول سکتا سر سبز و شاداب ہو سکتا ہے۔ لیکن جس درخت کی جڑیں ہی کاٹ دی جائیں وہ پھر کسی مدد یا کوشش و محنت سے بھی تر و تازہ نہیں ہو سکتا، اپنا اعادہ نہیں کر سکتا۔ اگر بچے بالکل ہی کم عمر نہ ہوتے تو شاید اس موقع پر انیسہ انہیں بھی نعیم کے حوالے کر دیتی۔ مگر اب یہی ایک مسئلہ تھا جس نے بکھری ہوئی منتشر انیسہ کو زندگی سے بادلِ نخواستہ باندھ رکھا تھا اور وہ جکڑی ہوئی ہر ہر تنگی اور گرہ کے باوجود ناشاد و ملول جینے پر مجبور تھی۔

کبھی کبھار اُس کے ابا آکر بچوں کو اپنے ساتھ شام کی تفریح کے لئے لے جاتے تب انیسہ خوش ہو جاتی مگر نعیم کو یہ بھی گوارا نہ تھا۔ وہ ہمیشہ انیسہ سے کہتا:

"بچوں کو اس طرح مت بگاڑو۔ ہمارے پاس موٹر نہیں، وسائل نہیں۔ اگر بچوں کو یہی عادت پڑ گئی تو بعد میں کیا ہوگا۔"

اور انیسہ چڑ کر کہتی:

"بیچے بے شک تمہارے ہی مگر میں آبا کو کس طرح روک سکتی ہوں۔ وہ تو سبب اپنی خوشی کے لئے کرتے ہیں۔ کیا بچوں پر اُن کا اتنا حق و اختیار بھی نہیں؟"

"سوال حق و اختیار کا نہیں عادت کا ہے۔" نعیم بھی چڑ جاتا مگر انیسہ ڈٹ جاتی۔

"تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ وہ موٹر نشینوں کی اولاد ہیں۔ اُنہیں موٹر کی فرورت اور اہمیت معلوم ہی ہونا چاہیئے۔ کیا اُن کی ماں موٹر نشین نہیں رہی نعیم؟"

"لیکن اُن کا باپ کبھی موٹر نہیں خرید سکتا۔ اُسے ٹھاٹ باٹ، شان و شوکت، تکبر سے نفرت ہے۔"

"تو میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"اُنہیں ایسی عادتوں سے بچانا تمہارا فرض ہے۔"

"لیکن تم بچوں کو کس سے بچانا چاہتے ہو اور کیوں؟ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں اپنے بچوں کو اپنے والدین سے بچاؤں؟"

"نہیں صرف دولت کے سحر، امارت کے غرور اور آسائشوں کے سرور سے۔"

"تو بہتر ہوتا تم کسی مزدور یا غریب گھرانے میں بیاہ رچا لیتے پھر تمہاری بیوی بچے از خود مشقت پسند ہوتے۔ تمہاری مسرت کا سبب بنتے۔ مگر تمہاری نظر ایسے گھر پر کیوں گئی جہاں مشقت کسی کا حصہ نہیں۔ تم نے ایسے گھر میں بیاہ کیوں رچایا جس سے تمہارے اصول تمہاری خوشی میں نہیں کھاتی۔ صرف اسی لئے نا کہ اپنی ناآسودگی کا انتقام لے سکو۔ اُس گھر کی اچھی روایتوں کو، امن و سکون کو، نظم و ضبط کو ملیا میٹ اور تباہ کر کے خوش ہو سکو۔ وہاں غلطیوں کا بیج بو کے بدنامی، رسوائی، غارت گری

کو دعوت دے سکو۔ لیکن یاد رکھو نعیم میں تمہاری اس سازش کو جیتے جی کبھی کامیاب نہ ہونے دوں گی۔ میں تمہارے خطرناک منصوبوں کو کبھی پروان نہ چڑھنے دوں گی۔"

"بکواس بند کرو۔ میں نے کوئی سازش نہیں کی ہے۔ میں کسی سے انتقام بھی نہیں لینا چاہتا۔ یہ سراسر تہمت و الزام ہے۔ میں نے اس ارادے سے کبھی تمہارے گھر میں قدم نہیں رکھا تھا۔ کاش کہ میں تمہیں اپنانے کی بھول نہ کرتا۔ میں واقعی ویسا کرتا جیسا کہ تم کہہ رہی ہو تب شاید میں بھی اتنے کرب آنگیں دقتوں سے نہیں گزرتا۔ مگر جو کچھ ہوا ایک فاش غلطی کے سوا کچھ نہیں۔ میری ناتجربہ کاری، نادانی، مجنونانہ خواہش کے سوا کچھ نہیں۔ میری تو ایک ہی بھول نے سب کچھ تاراج کر دیا۔"

"کونسی بھول، کیسی بھول نے۔ کیا میرے والدین نے تمہارے آگے ہاتھ جوڑے تھے کہ انیسہ سے بیاہ کر ہی لو ورنہ اُسے کوئی بر نہ ملے گا۔ کیا تم خود دست بستہ اس خواہش کے ساتھ نہیں آئے تھے جسے اب بھول ٹھہرا رہے ہو۔ جس پر اتنا متاسف و ملول ہو۔ کاش کہ میں خود اُس ساعت سے پہلے مر جاتی۔ کون سے راحت کے پالنے میں جھلا دیا ہے تم نے مجھے؟ جو اب آنکھیں دکھا رہے ہو!"

"جو کچھ بھی سہی مگر میرے ساتھ تمہیں میری پسند کے مطابق ہی رہنا ہوگا۔ میں ایک محنت کش انسان ہوں۔ ایک ایسی تحریک سے وابستہ ہوں جو متموّل کی جڑیں کھود کر پھینک دینا چاہتی ہے۔ جو طبقاتی برابری اور مساوات کو ہی اپنا عین اُصول اور تقاضائے انسانیت مانتی ہے۔ نہ میں نہ میرے بچّے کبھی اُس راہ پر جا سکتے ہیں جسے تم پسند کرتی، چاہتی ہو۔"

"اس لئے تم نے اپنا پہلا پانسہ ایک متموّل گھرانے پر پھینکا۔ شاباش! نعیم شاباشش!! تم اُس گھر میں اپنائیت کے ناطے آئے مگر تمہارا منشا دراصل اُس کی بنیادیں ہلانا تھا۔ اُس کی ہر ہر دولت کو تقسیم کر دینا۔ ماشاءاللہ! خوب

اُصولِ مساوات اور انصاف ہے تمہارا۔ لوگوں کو لوٹنا، لوگوں کو چھیننا، لوگوں کو دھوکا دینا۔ اپنی قابلیت کا ہردم ڈھنڈورا پیٹنے والے کیا تم اتنا بھی نہیں سوچ سمجھ سکتے کہ ہر طبقہ اپنی عادتیں، اپنا مزاج، اپنی عقل و ادراک، اپنا طریقۂ حیات ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔"

"اور اسی لئے شاید ہمیں برداشت کرنا ہے۔ صرف برداشت کرتے رہنا کیونکہ بدقسمتی سے ہم ایک ایسے رشتے میں بندھ چکے ہیں انیسہ جو آسانی سے توڑا نہیں جا سکتا۔" نعیم خلاؤں میں تکنے لگا مگر انیسہ تنک کر بولی: "یہ بھی کر ڈالو۔ کس نے روکا منع کیا ہے تمہیں۔ اب میرے تمہارے درمیان پیار کا رشتہ بھی کونسا باقی رہ گیا ہے۔" نعیم نے سخت کڑواہٹ محسوس کی مگر انیسہ اندر ہی اندر پرسکون ہو گئی۔ اُس کا بے قرار مضطرب دل نعیم کو تڑپا کر اطمینان محسوس کرنے لگا۔ تکلیف دینے والوں کو ویسی ہی تکلیف سے گزارو تاکہ وہ بھی تکلیف کی حال حقیقت سمجھ سکیں۔ اُن سے منت کرنے۔ آہ وزاری یا رحم کی درخواست کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اُس نے سوچا اور عرصہ بعد گہری اور میٹھی نیند سو گئی۔ نیند جو اُس کی آنکھوں سے چھین لی گئی تھی۔ نیند جو صحت مندی کی علامت ہے۔ عافیت کی نمائندہ، نیند جو ایک نعمت ہے لیکن ٹھیک اُسی رات کو نعیم رات بھر جاگتا رہا۔ جاگتا اور کفِ افسوس ملتا رہا۔ کیا انسان کی ایک غلطی اتنی دل آزار، دل شکن، اتنی خطرناک ہو سکتی ہے؟ کیا صرف ایک غلطی کئی غلطیوں کا مجموعہ ہوتی ہے؟ آخر انیسہ کو اِتنا بولنے کی ہمت کس طرح ہوئی۔ انیسہ کے پیچھے کون ہے۔ انیسہ کے عمق میں کون، کون جو اُسے اتنی جرأت عطا کر رہا ہے۔ اتنی طاقت اور خود اعتمادی؟

کہیں رابعہ نے تو یہ کھیل نہیں بگاڑ دیا؟ بھولی اور بھلی رابعہ نے! کیونکہ ایک عورت اتنی حساس اتنی خونخوار اتنی جری اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب

تک مرد کی کوئی غلطی اُس کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ مرد کی ایسی غلطی جو خود عورت کی ذات پر ایک کاری چوٹ ہو۔ ایک بھرپور ضرب۔ ایک تیکھا وار ـــــ عورت صرف اُسی وقت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے جب خود اُس سے نفرت کا حال اُسے بھی معلوم ہو جائے۔ اُس نے تو چاہا تھا تعلیم ختم کرتے ہی انیسہ کو میدانِ عمل میں اُتار دے۔ لیکن افسوس اب یہ خیال پورا نہ ہو سکے گا۔ انیسہ کبھی اُس کے منشا کے مطابق کام نہ کرے گی۔

افسوس! افسوس!! نعیم دیر تک کروٹیں بدلتا اور سوچتا رہا تب اچانک ایک نیا خیال اُس کے ذہن میں اُبھرنے جگہ بنانے لگا۔

کسی نہ کسی ترکیب سے انیسہ کو پھانسنا چاہیے۔ اُسے ایسے شکنجے میں جکڑنا جو اُس کی زبان درازی اور جرأت کو بے زبان اور بزدل بنا دے۔ اُس میں عورت کی کمزوری کو احتیاط سے اُبھارنا ہو گا تا کہ وہ خود کسی غلطی کی مرتکب ہو کر اُس غلطی کے نتیجے میں پھر تمام عمر سزا ئے خاموشی بھگتتی رہے۔ پھر ہمیشہ میرے اختیار اور قابو میں رہے۔ غلطی ہی پھر وہ ہتھیں بن جائے جو اُسے سدا چبھتی، کھٹکتی جلن سے آشنا رکھے۔ مجھ پر حاوی نہ کر سکے۔

نعیم تڑپتا رہا۔ تڑپتا ہی رہا۔ وہ کیا چاہتا تھا، کیا ہو گیا؟ اُس نے کیسے اچھے کتنے رنگین سہانے خواب دیکھے تھے۔ مگر ان کی تعبیریں کتنی بھیانک بے رنگ بُری نکل آئیں۔

بے کیفی، بدمزگی، پھیکا پن، زندگی کتنی سنسان ہو گئی۔ شہد کی ایک بوند شراب کا ایک قطرہ، حُسن کا ایک جلوہ بھی تو پاس نہ رہا۔

نعیم نے نحوست کو فقت محسوس کی۔ انیسہ پر اُسے بے حساب غصہ آیا کمبخت عورت کہیں چین سے نہیں رہ پاتی۔ سسرال میں وقتوں کی شاکی تھی لیکن مائیکے میں

سہولتوں سے بھی تو نباہ نہ کر سکی۔ اس طرح بھاگی بھاگی لوٹ آئی جیسے کسی نے گلے پر خنجر رکھ دیا ہو۔ نہ صلاح، نہ مشورہ، نہ ہی کوئی قبل از وقت اطلاع۔ عجلت میں تو خود اُسے ڈھنگ کی کوئی بات نہ سوجھ سکی تھی۔ کیا مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی ہر وقت کے راشن کے فکر سے بھی جان چھوٹی ہوئی تھی۔ اور سہانی رابعہ الگ ہاتھ آ گئی تھی۔ زندگی لطف اور لذت بن رہی تھی مگر اس عورت نے سب چوپٹ کر دیا۔ جنت تو ہاتھ سے گئی ہی مگر دوزخ بھی تو گلے آ پڑی۔ اس گھاٹے کے سودے میں اُسے ملا کیا؟

ناپسندیدہ احساسات اور ناگوار خیالات کے کن کھجورے اپنے کھردرے اور نوکیلے پاؤں سے کانٹوں کی طرح اُسے کچوکے دیتے اُس کی سوچ اور تخیل پر رینگتے رہے اور پوری رات بے آرام گزر گئی۔

اگلی صبح جب انیسہ جاگی تو اُس کے چہرے پر رات بھر کی مکمل میٹھی نیند کا گہرا سکون اور سرور انگڑائیاں لے رہا تھا۔ مگر بے چارے نعیم کی صورت آتنی سی نکل آئی تھی۔ شب بیداری اور فکر سے مرجھائی کھلائی مفلس اور پژمردہ جیسے رات بھر کوئی کوڑوں سے نعیم کی مرمت کرتا رہا ہو۔ اُس پر زخموں کی یورش کرتا رہا ہو۔ ایسے میں جب نعیم نے کنکھیوں سے انیسہ کو اور انیسہ نے چور نظروں سے نعیم کو دیکھا تو انیسہ رہ رہ کے مسکرا رہی تھی اور نعیم رہ رہ کے بل کھا رہا تھا۔ ایک پرسکون تھا مگر دوسرے کے اندر ایک قیامت ایک حشر برپا تھا۔ اس صبح خطرناکی ہی خطرناکی سارے ماحول پر مسلط تھی۔ کالے بادل جو سر پہ منڈلا رہے تھے۔ ڈراؤنے سائے جو اُس پاس سے گزرے جا رہے تھے۔ نامانوس شبیہیں اور پرچھائیاں جو نگاہ کو خوفزدہ اور احساس کو اسیر کیے جا رہی تھیں مگر گویائی نہ بن پا رہی تھیں۔

ٹکراؤ اور تصادم میں جو درست خون خرابہ ہوتا ہے وہ اس مشکوک منوحس

سناٹے سے کتنا کم کاری، کتنا زیادہ قرینِ قیاس اور قابلِ قبول ہوتا ہے۔ لیکن یہ بے تعلقی یہ اجنبیت یہ بے زبان درشتی اللہ! اللہ!!

نعیم کا جی چاہا ناشتے کے سارے برتن چکنا چور کر دے۔ بلا تامل انیسہ کے منھ پر دے مارے چیخنے، چلّانے، گرجنے برسنے لگ جائے۔ کچھ تو ہو۔ کچھ ایسا جو اُردگرد کی خطرناکی کو کم کر دے۔ کچھ وہ کہے کچھ انیسہ کہے۔ دونوں آپس میں لڑجھگڑلیں مگر اس طرح چُپ چُپ اجنبی اغیار نہ بنے رہیں۔ لیکن نعیم کی انتہائی خواہش کے باوجود صبح کی اولین ساعتیں بغیر کسی واقعے کے صرف کشمکش میں گزر گئیں حتیٰ کہ وہ تیار ہو کر اپنی مصروفیتیں نپٹانے ناچار گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ مگر تمام مصروفیتوں کے دوران وہ جمیل کو یاد کرنا نہ بھولا۔

جمیل جو اُس کے کالج کا ایک ساتھی تھا۔ اپنی عیاشی اور عورت پرستی کے لئے بے حد مشہور، جو عورت کے حصول کے لئے سب کچھ کرسکتا تھا۔ اپنے دوستوں کو بھول سکتا۔ اُنہیں دھوکا دے سکتا۔ ہر کسی سے غداری کرسکتا تھا۔ اُسی جمیل کے تخیل کے ساتھ نعیم کی بے بسی بہادری بنکر پھر سر اُٹھانے لگی۔ اپنا سینہ تان کر یوں اکڑ کر چلنے لگی جیسے ہر مقابل سے کہنا چاہتی ہو۔ "پرے ہٹ جاؤ۔ راستہ دے دو، ورنہ ناحق کچلے جاؤ گے۔

اُس رات جب نعیم گھر لوٹا تو اُس کے ساتھ جمیل بھی تھا۔ پھر جمیل باقاعدہ آنے اور انیسہ سے گھُلنے ملنے لگا۔

"بھابی! بھابی!! کیا ایک پیالہ چائے بھی نہیں ملے گی۔ کیا ایک مسکراہٹ بھی نہیں۔ اچھا میں خود آکر بنا لیتا ہوں آپ کیوں زحمت کریں!"

"دیکھئے تو میں آپ کے لئے کتنا خوبصورت گلدستہ لایا ہوں۔ پسند آیا یا نہیں؟"

"ارے یہ رنگ تو آپ پر بہت زیچ رہا ہے۔ غضب ہے بالکل۔"
"کیا آپ کو گھومنے پھرنے تفریح کرنے کا شوق نہیں۔ چلئے آج کوئی پکچر دیکھ آئیں۔"

"توبہ ہے۔" زیچ آکر انیسہ نے نعیم سے کہا: "یہ تو بہت بے تکلف شخص ہے۔ ضرورت سے زیادہ ہی۔ مجھے اچھا نہیں لگتا اس کا آنا بند کرو۔"
"خوب۔" نعیم جھنا کر بولا: "تو اب تم میرے دوستوں اور ملاقاتیوں پر بھی ـــ اعتراض کرنا چاہتی ہو۔ معاف کرو۔ تمہارے لئے میں اپنے دوستوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اُن سے بُرا نہیں ہو سکتا۔"
انیسہ چُپ ہو گئی۔
پھر ایک شام جب نعیم نہیں تھا جمیل شراب کے نشہ میں دھت آیا اور بے قابو ہونے لگا۔ انیسہ بچتی رہی ، بچتی رہی مگر آخر کار جمیل اُس پر آ پڑا۔ پاس پڑوسیوں کے خیال سے انیسہ چیخ بھی نہ سکی، صرف مدافعت کرتی رہی۔ ٹھیک نعیم اسی وقت گھر میں داخل ہوا اور جمیل کے چلے جانے کے بعد انیسہ سے بولا:
"تو یہ کھیل ہو رہا تھا۔ جمیل اسی لئے اسقدر آ رہا تھا اور بنتی اس طرح ہیں جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔"
انیسہ نعیم کو گھورتی رہ گئی۔ اپنی صفائی میں ایک لفظ نہ کہہ سکی۔ نعیم اُسے ہولناک ترغیبی الزامات میں ماخوذ کرتا رہا۔ مگر انیسہ سوائے رونے کے کچھ اور نہ کر سکی اُس نے ہر بار نعیم سے کہنا چاہا۔ خدا کے لئے غلط نہ سمجھو میری حفاظت تمہارا فرض تھا۔ مگر تم نے خود توجہ نہ کی اور اب ..... !"
مگر اب تو ایک واہیات الزام اُس پر لگ چکا تھا بلاشبہ وہ ایک بُری عورت ٹھہرائی جا چکی تھی۔ پاک باز، اور با عصمت عورتوں کی صف سے نکالی جا چکی

تھی۔ چور نہ ہو کر بھی چور گردانی جا چکی تھی۔ لہذا اس ناگہانی چوٹ سے سہم کر وہ صاف دلی اور جرأت جو نعیم کا مقابلہ کرنے کے لئے اُس میں خود بخود پیدا ہو گئی تھی پھر سمٹ سکڑ گئی، بے دم ہو گئی۔

انیسہ کے اگلے بیشمار دن پھر آنسو بہاتے گزرے۔ اپنی بدنصیبی پر متاسف ملول آزردہ مگر نعیم کی کبیدہ خاطری مسرور اور فاتح ہو گئی۔ عیاری کے آئینہ میں خود کو سراہتی ہوئی بے وقوف عورت تو بے وقوف ہی رہی نا تو کمزور وبے بس ثابت کر دی گئی نا! تو جتنی بڑی تھی اُس سے کئی سو گناہ بڑی قرار دے دی گئی نا! اب کوئی فکر نہیں میرا پھینکا ہوا پانسہ ٹھیک پڑ چکا تیرا پھندہ بن چکا۔ اب میں تیرے نسائی غرور اور تحکم کا گلا ہر وقت بٹیر بٹیر کی طرح مروڑ سکتا ہوں۔ میں نے تیری طرار زبان ہمیشہ کے لئے قلم کر دی ہے۔ تیری بُرائی کی قینچی خود تیرے ہاتھ میں تھما دی ہے۔ کہ اس سے اپنے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کرتی رہے۔ اور ہمیشہ اپنے زخم پر نگاہ رکھے ہمیشہ خاموش رہ ورنہ تیرا اپنا زخم سڑا کر ناسور بنا دیا جائے گا ہا ہا ہا!! —— اُس نے بے اختیار قہقہے لگائے۔

اور نہ جانے کتنی بے شمار راتیں انیسہ نے سوجی ہوئی، متورم آنکھوں کے ساتھ کاٹیں۔ جب کہ ان تمام راتوں میں نعیم نے نہایت خوش بشاش سکون کی بھرپور نیند سوتا۔ پھر حسین و رنگین خواب دیکھنے لگا۔ پھر سکھ اور آرام کی بنسری بجانے لگا۔

اس واقعے کے بعد جمیل پھر کبھی نعیم کے گھر نہیں آیا۔ پتہ نہیں جمیل کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا وہ محروم اپنی خواہش سے تو گیا ہی مگر انیسہ کی زندگی کے حلق پر بھی ایک ایسی چھری رکھ گیا جو انیسہ کی ذرا سی بداحتیاطی اور لغزش پر اُسے لہولہان کر سکتی ہے، کاٹ سکتی، اُس کا سر تن سے جدا کر سکتی تھی۔

ندامت اور شرمندگی کے موٹے لبادے۔ انیسہ کے وجود کو ڈھکے رہتے

تھے اور مجرم و قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی انیسہ ایک قاتل احساس کا شکار اندر ہی اندر گھٹتی جا رہی تھی۔

اُن ہی دنوں نعیم نے انیسہ کو یہ بھی جتا دیا کہ اگر ممنوع جماعت میں اُس کی شرکت و شمولیت کی بات کسی کے کانوں تک پہنچی تو پھر نعیم بھی اُس کی ذلیل حرکت کا ذکر فوراً سب کے کانوں تک پہنچا دے گا۔ اور اپنی زندگی، اپنی عزت کسے پیاری نہیں ہوتی۔ تنؤ تکلیفوں، عذابوں، آفتوں کے باوجود انسان اپنی زندگی بالکل ہی ختم کر دینا نہیں چاہتا۔ دنیا کا اسیر، دنیا کا مقصور انسان اپنی بدبختی اور خرابی پر صرف آنسو بہا کر ہی اکتفا کر لیتا ہے، مگر مرنا پسند نہیں کرتا۔ تمام رنجشوں سے نجات کی خاطر بھی خود اپنا گلہ نہیں گھونٹ سکتا۔

اب تک انیسہ اسی کشمکش میں مبتلا تھی کہ خفیہ جماعت سے نعیم کی وابستگی کی اطلاع اپنے والدین تک پہنچائے یا نہیں اس جھنجھٹ سے نعیم کی دست برداری کے لئے اُن سے کوئی مدد چاہے یا نہیں مگر اب تو یہ موقع بھی اُس سے چھینا جا چکا تھا۔ اب تو وہ فقط حبس دوام کی قیدی تھی۔ مکر کا ایسا شکار، ایسا لقمہ جو کسی وقت بھی نوکیلے دانتوں تلے چبایا اور بغیر پانی کے نگلا جا سکتا ہے۔

اب نعیم اپنی سرگرمیوں کا بے دھڑک ذکر کرتا۔ انیسہ کو بڑے فخر سے سب کچھ سناتا، اُسے اُکساتا۔ انیسہ سب سنتی مگر کوئی جواب نہ دیتی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا وہ کس راہ کو اپنائے۔ اُس راہ کو جس پر وہ برسوں سے چلتی آ رہی تھی یا اُس راہ کو جس پر وہ کبھی نہیں چلی جو نہ جانے اُسے کہاں لے جائے۔ وہ اس تحریک سے وابستہ نہ بھی ہو تب بھی نعیم کا اور اُس کے بچوں کا مستقبل کتنا خطرناک تھا۔ اُس کی رہی سہی نیند بھی غائب ہو گئیں ہر آہٹ اُسے سنگینوں قدموں کی آمد اور ہتھکڑی بیڑی کی ناگوار جھنکار محسوس ہوتی۔ وہ بار بار دعا کرتی۔ خدا کرے سب ٹھیک رہے سب ٹھیک لیکن اُس نے

فکر و تردد سے بے پرواہ ایک رات ابا کی تیز رفتار موٹر آندھی طوفان کی طرح دندناتی ہوئی بیوقت اُس کے دروازہ پر آ رُکی تو جیسے انیسہ کی سانس بھی رکنے لگی۔ پھر ملال کے گاڑھے رنگ سے اٹا اٹا ابا کا متفکر چہرہ اُس کے روبرو آکر ٹھہر گیا تو وہ غش کھاتے کھاتے بچی۔ اُن کی گمبھیر آواز پہلی بار انیسہ کے کانوں سے کسی چیخ کی طرح ٹکرائی!!

"نسیم گرفتار ہو چکا ہے انیسہ!" تو جیسے ایک گولی سنسناتی ہوئی اُس کی کنپٹیوں کے قریب سے گزر گئی۔ اُسے چکر سا آگیا۔ نہ جانے کیسے آنسو اُس کی دردمندی کی آنکھوں میں آگئے۔ اُس نے خاموشی سے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ ابا سے کیا کہتی تب ایک ذرا سے وقفہ کے بعد ابا نے خود کہا: "تم میرے ساتھ چلی چلو۔ یہاں اکیلی رہ کر کیا کرو گی؟" یہ کہتے ہوئے اُن کی آواز ذرا سی مدہم پڑ گئی انیسہ دوڑ کر اُن کے سینے سے لپٹ گئی۔ اُسے لگا وہ ننھی بچی بن گئی ہے اور ابا کا سہارا بہت ضروری ہے۔ وقت کے اُس حصے میں وہ اپنے باپ کی محبت کے علاوہ کچھ اور نہ محسوس کر سکی اور جب باپ کے سینے سے لگے لگے اُسے قدرے سکون آگیا تو وہ ضروری سامان سمیٹنے لگی۔

کچھ ہی دیر بعد موٹر اُسے لئے آگے بڑھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ بالکل چپ چاپ بیٹھی رہی پھر اُس نے پوچھا: "کیا سب کو پتہ ہے ابا؟"

"ہاں" اُس کے باپ نے کہا: "یہ خبر ہر طرف پھیل چکی ہے۔ میں نے ضمانت داخل کرنے کی کوشش کی تھی، مگر نسیم راضی نہ ہوا۔"

"ابا!" انیسہ نے کہا۔ "میں خود کو خوش قسمت سمجھتی تھی مگر میں کتنی بد قسمت نکلی کہ آپ کی پریشانی اور دُکھ کا سبب بنی۔ اگر میں پیدا ہی نہ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا!"

"ہمت اور استقلال سے کام لو انیسہ۔ مایوسی کسی مسئلے کا حل نہیں۔" اُس کے باپ نے ایسی آواز میں کہا۔ جو ہمیشہ سے بڑی مختلف تھی اور اس آواز سے انیسہ اُن کے دل کی حالت بخوبی سمجھ گئی۔ پھر جب گھر پہنچکر موٹر پورٹیکو میں رُکی تو بیرونی صحن

مکان سے خلافِ معمول سناٹے نے فوراً انیسہ کو بتا دیا کہ اس وقت اس گھر کے مکینوں کا کیا حال ہے۔ اور جب من من بھر کے قدم لئے وہ مکان کے اندرونی حصّے میں پہنچی تو اُسے اپنی ماں بالکل ایک بُت کی طرح نظر آئیں۔ انیسہ کا دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہا۔ مگر ایک آنسو گرائے بغیر یا ایک لفظ کہے وہ بھی ایک بت کی طرح ان کے قریب پہنچ کر بیٹھ گئی۔ پتہ نہیں کسطرح اور کیسے اُس کے ہونٹوں سے فقط کلماتِ کورنش نکلے اور پھر سناٹا پہلے سے زیادہ دبیز اور گہرا ہو گیا۔ اُس آنسو کی طرح پُر درد اور جانکاہ جو اندر سے تو اُمنڈ اُمنڈ کر آتے مگر آنکھ سے باہر نہ گر سکے۔ پھر اُسے اتنی بھی مجال نہ ہوئی کہ وہ اپنا درد اپنی ماں کے آگے اُنڈیل دیتی۔ ان کے پہلو میں سمٹ کر ان کے سینے سے لگ کر یہی کہہ دیتی۔ مجھے معاف کر دیجئے امّی۔ میں نے سب کچھ چھپایا۔ میں خود اس خطرے کی متوقع تھی مگر میں نے آپ کو نہیں بتایا۔ اس کے تدارک کی کوئی کوشش نہیں کروائی۔

وہ اپنی ہی سوچ اور ندامت میں غرق تھی کہ اُس کی ماں نے خاموشی کو خود توڑا۔ "بچوں کو کمرے میں لے جا کر آرام سے سُلا دو انیسہ، رات زیادہ ہو چکی ہے۔" اور تعمیلِ حکم میں انیسہ کسی کل کی گڑیا کی طرح ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ حالانکہ وہ اپنی ماں کے پاس سے اُٹھنا نہ چاہتی تھی۔ اُن کے سامنے خوب رونا چاہتی تھی مگر وہ اُٹھ گئی اور نعیم اُس پھانس کی طرح کھٹکنے لگا جو نکالے نہ نکلتی ہو۔ لوگ کیا کہیں گے۔ لوگ کیا سوچیں گے۔ کیا یہ سب نعیم کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اُس کی اپنی شخصیت کی بھی ٹریجڈی نہیں ہے۔ رنج کا طوفان انیسہ کے ذہن میں سائیں سائیں کرتا جھنجوڑتا رہا اور پلنگ پر خاموش پڑی وہ اپنے ہی آنسوؤں کی نمی اور کھارا پن محسوس کرتی رہی۔ زندگی کا سارا اُکلا کھردرا پن۔ اُس نے سن رکھا تھا کہ اچھا داماد بھی گھر کے بیٹے کے برابر ہوتا ہے۔ گھر کا ایک اہم ستون مگر نعیم تو فقط وہ شہتیر ثابت ہوا جو خود

آپ تو گرے ہی مگر اپنے بوجھ تلے گھر کے اچھے اور مضبوط حصے بھی منہدم اور پامال کر دے یہ گھر جہاں وہ پیدا ہوئی پلی بڑھی پھر شریلی شہنائیوں کی گونج میں جہاں سے رخصت ہو گئی آج اسی گھر میں اس حالت میں رہنا اُسے کتنا عجیب اور سوہانِ روح محسوس ہو رہا تھا۔

سوچتے سوچتے پتہ نہیں کب انیسہ کی آنکھ لگ گئی تھکن اور نیند نے اُسے تمام ذہنی جنوں سے چھٹکارا دلا دیا۔ جب صبح ہوئی تو تمام لوگ اُسی انداز میں اُسکے اطراف جمع تھے جیسے ہاسٹل میں رہنے والا گھر کا کوئی فرد مدّت بعد تعطیلات گزارنے پھر اپنے گھر لوٹ آیا ہو۔ اور ہر ایک کی بے حد توجہ محبت اور مسرت کا سبب ہو۔

دن بھر انیسہ کو یہ سوچنے کا موقع بھی نہیں ملا کہ وہ کس افتاد اور واردات سے گزر کر آئی ہے۔ کتنے ناگوار، ناخوشگوار واقعات سے۔ اُس کے دونوں بچے مگن تھے۔ اور پسندیدہ کھلونوں کی طرح ایک سے دوسرے گود میں ہمک رہے تھے۔ بڑا بچہ اچھی طرح چلنے لگا تھا۔ چھوٹا بھی کھسکنے لگا تھا۔ مگر اس گھر میں کوئی یہ نہ چاہتا تھا کہ یہ دونوں بچے اپنے پاؤں کو ذراسی بھی زحمت دے ڈالیں وہ بس گودوں ہی گودوں میں تھے۔ ہر ایک کی آنکھ کا تارا بنے ہوئے۔

مسلسل ذہنی انتشار اور اضطراب نے انیسہ کو ذہنی مریض بنا دیا تھا۔ لہذا ہر طرف سے توجہ اور آرام ملتے ہی وہ کچھ اس طرح سوئی کہ گھر کا ہر فرد اُس کی نیند پر حیران ہکا بکا رہ گیا۔ کیا انیسہ آرام کی اتنی بھوکی، بے فکری اور فراغت سے اسقدر بے بہرہ اور دُور رہی ہے؟

دوپہر میں کسی نے اُسے کھانے کے لئے نہیں جگایا۔ وہ پہلے جی بھر آرام تو کر لے۔ مگر سہ پہر میں انیسہ کی نیند خود بخود ٹوٹ گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھی۔ ابّا بہت محتاط انداز میں امی سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ سننا چاہتی تھی مگر گفتگو

اسس قدر آہستہ ہو رہی تھی کہ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ اُسے سخت بھوک لگی تھی۔ چنانچہ منھ ہاتھ دھوکر وہ سیدھا کھانے کی میز پر جا بیٹھی۔ مدت بعد اچھا کھانا اُسکے سامنے آیا۔ اُس نے خوب سیر ہوکر کھایا تھا۔ پھر حالتِ سکون میں وہ اُس کنج میں چلی گئی جو ایک چھوٹے سے باغیچہ کی طرح آراستہ تھا۔ جہاں پھول مسکرا رہے تھے اور تازگی ایک ادائے محبوبیت سے جھوم رہی تھی۔ گیلی کیاریاں خنکی اور تراوٹ کا احساس دلا رہی تھی۔ دھوپ ڈھل ڈھل کر بڑھتے ہوئے سایوں، سے بغلگیر تھی۔ ہرطرف شادابی تھی، عافیت تھی تب پہلی بار انیسہ نے کچھ اس طرح سوچا جس طرح ایک بیوی سوچتی ہے۔ کیا نعیم کے غیاب میں اُسے نعیم کے گھر کو چھوڑ کر اس طرح اپنے ماں باپ کے گھر آجانا چاہیئے تھا، کیا یہاں آجانے میں وہ حق بجانب ہے یہ ٹھیک ہے کہ نعیم میں اور اُس میں اب پیار و محبت کا کوئی نازک اور نرم رشتہ باقی نہیں رہا۔ پھر بھی کیا یہ اُس کی ذمہ داری نہ تھی کہ وہ نعیم کے گھر کی حفاظت کرتی۔ اُس کی عدم موجودگی میں اُسے سنبھالے رہتی؟ ایک انجانا غیر واضح سا احساس کانٹے کی طرح انیسہ کو کُریدنے لگا۔ اُسے اپنی قوّتِ فیصلہ اس قدر لڑکھڑاتی ہوئی محسوس ہوئی کہ وہ لپکی لپکی فوراً اپنی ماں کے پاس پہنچی۔ ابّا اب وہاں نہیں تھے۔ مگر امی فکر میں غلطاں اُداس، اُداس سی تھیں۔ اُن کی تابناک آنکھیں کسی گمنام دھند میں ملفوف تھیں اور اُن کا تمام چہرہ بے حد گمبھیر اور غمناک نظر آرہا تھا۔

"امّی ————"! انیسہ نے چوکھٹ پر رُک کر پوچھا: "کیا میں اندر آجاؤں؟"

ماں نے اُسے گھوم کر دیکھا، بولیں: "ہاں! آؤ، آجاؤ۔"

انیسہ اُن کے پاس پہنچ تو گئی مگر دفعتاً گڑبڑا گئی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا وہ کیا کہے۔ وہ سارے الفاظ جو اُس نے سوچے تھے، کچھ اس طرح گم ہو گئے۔

پھر اُس کی ماں نے خود پوچھا: "تمہارے بچے آرام سے تو ہیں نا انیسہ، انہیں کسی بات کی کمی یا تکلیف تو نہیں؟"

"اوہ! امی امی!!" انیسہ نے ماں کا ہاتھ چوم کر کہا: "انہیں یہاں کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ وہ تو یہاں اپنے گھر سے بھی زیادہ خوش اور آرام سے ہیں!"

"تم بھی اسی طرح رہو کوئی تکلّف محسوس نہ کرو۔ جس چیز کی خواہش یا ضرورت ہو فوراً طلب کر لیا کرو۔ اپنی پسند کے کھانے بنوا لیا کرو۔ ہنسو، بولو، خوش رہا کرو۔ آگے جو ہوگا دیکھے جائے گا۔

انیسہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ یہ توجہ یہ محبت یہ دلداری کتنی مدّت سے وہ ایسے لطیف جذبوں سے بچھڑ چکی تھی۔ کتنی مدّت بعد اُسے زندگی پھر اپنی لگ رہی تھی۔ اپنائیت کے اس ماحول میں سراسر اپنی مگر اُس نے اپنی نم آنکھیں احتیاط سے خشک کر لیں۔ اور مدہم آواز میں بولی: "کیا ابّا بہت خفا ہیں امّی؟ کیا ابّا بہت فکرمند، بہت ناراض، ناخوش؟"

"یہ معاملہ خود کتنا تکلیف دہ ہے انیسہ۔ ہم نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا!"

"میں بہت شرمسار ہوں امّی، میں ہر سزا قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"سزا!" امّی نے حیرت اور بھیگے پن سے کہا۔ سزا تو خود تمہیں مل رہی ہے۔ پتہ نہیں کس بھول اور لغزش کی اور کیا یہ سزا خود تمہارے لئے کافی نہیں کہ تم ایک ایسے شخص کی بیوی بن گئیں۔"

انیسہ کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے۔ چنانچہ سوچ سوچ کر اُس نے کہا:

"کیا نعیم سے علیحدگی اختیار کر کے میں آپ کے اطمینان کا باعث بن سکتی ہوں، امّی!؟"

"کیا ۔۔؟" ماں نے کڑی نظر سے اُسے دیکھا۔ "پاگل لڑکی تمہیں یہ سوچنے
کی ہمّت اور کہنے کی جرأت کس طرح ہوئی۔ جاؤ اور اپنے آپ کو ایسے مہمل خیالات
سے دُور رکھو، خرابی کو دُور کرنے زیادہ خرابی سے کام نہیں لیا جانا چاہیے۔" انہوں
نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ڈال دیا۔ اور انیسہ بھیگی بلّی کی طرح وہاں سے سرک گئی پھر
اپنے والدین کے سکون اور اپنے مستقل بچاؤ کی یہ آخری مبہم و موہوم اُمید بھی اُس
کے دل میں دم توڑ گئی۔ اس امید کے بالکلیہ خاتمہ کے بعد زندگی اُسے مزید خوفناک
محسوس ہوئی۔ اشد تقاضوں کی طالب اب تک جتنی مسافت اُس نے طے کی تھی وہ
سب تو رائیگاں اور برباد ہی گئی اب آگے سفر میں نہ جانے اور کیا کچھ برداشت
کرنا پڑے۔ اپنی ماں کی تنبیہ دیر تک اُس کے وجود میں گونجتی رہی۔ جیسے اب یہی اُس
کا زادِ راہ ہو۔

نعیم اپنی فوری رہائی کے لئے انیسہ کے والد کی ضمانت قبول کرنے سے
انکار کر چکا تھا۔ پنی جماعت کی ہدایت و منشاء کے بغیر وہ اپنے طور پر کچھ کر بھی نہ
سکتا تھا۔ لہٰذا گرفتاری کے بعد کچھ دنوں تک وہ خاصہ بے فکر اور بے نیاز بھی
رہا۔ مگر پھر جلد ہی جیل کی بند اور حابس کوٹھری میں اُس کا دم گھٹنے لگا۔ جوں جوں
دن گزرنے لگے اُس کی وحشت بڑھنے لگی۔ وہ سوچنے لگا کیا اُس نے ضمانت
پر رہائی قبول نہ کر کے کوئی زبردست غلطی کی ہے؟ اور اُسے پہلی بار محسوس ہوا
کہ آزمائش کے تصوّر اور آزمائش کے عمل میں کتنا فرق ہے۔ آزمائش کتنی مشکل اور
حوصلہ طلب۔ اُس نے کٹھن زندگی ضرور گزاری۔ مگر یہ قید؟ کیا کوئی صورت ایسی
نہیں ہو سکتی کہ وہ اس جھنجال سے فوری چھٹکارا پا جائے؟ اگرچہ اس طرح کی رہائی
میں اُس کی خودداری اور استواری کی علانیہ شکست اور توہین ہوگی۔ مگر پھر بھی
آزادی کتنی ضروری ہے؟ وہ قید میں کمزوری کا شکار ہو گیا۔ لہٰذا اپنی انا کو پسِ پشت

ڈال کر اُس نے پارٹی سے درخواست کی کہ اُسے ضمانت قبول کرنے کی اجازت دی جائے۔ یہ بڑی شُبک کرنے والی خواہش تھی مگر نعیم قید سے نجات پانے کے لئے کچھ بھی کر گزرنا چاہتا تھا۔ وہ جیل سے باہر نکلکر سب کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ جیل کے اندر رہ کر نہیں اور خاص مصلحتوں کی بنا پر اُسے اجازت مل گئی۔ وہ ایک مُجرم کی طرح نگاہ میں آچکا تھا۔ لہذا پھر اُسے سختی سے یہ ہدایت بھی ملی کہ اگلے کافی عرصے تک وہ بے حد محتاط رہے۔ مزید جماعتی کارکنوں کی گرفتاری یا کسی اہم اڈّے پر دھاوے کا ذریعہ نہ ثابت ہو اور مزید طلبی یا ہدایت تک وہ تمام عرصہ محض سماجی، انداز میں گزارے۔

یوں نعیم کو دو طرح کی فراغت اور آزادی ملی۔ ایک زندانِ حکومت سے اور دوسری زندانِ ذمہ داری و ضابطے سے لہذا وحشت گھٹن اور ذمہ داری سے چھوٹ کر جب وہ اپنے سُسرال پہنچا تو انیسہ یکلخت اُسے قابلِ توجہ ضرور لگی۔ مگر رابعہ کا خیال فوراً اُس پر حاوی ہو گیا۔ انیسہ کی آنکھیں بھی نعیم کو دیکھ کر پہلے دھندلائیں پھر چمک ضرور گئیں۔ مگر رابعہ کی موجودگی کے احساس نے پھر اُسے بھی پژمردہ کر دیا۔ یوں دونوں ایک دوسرے کی پذیرائی۔ ایک دوسرے کا استقبال نہ کر سکے اور دُوری ایک دیوار کی طرح پھر دونوں میں قائم ہو گئی۔

ایک نئی دلچسپ اور بھرپور زندگی سے روشناس ہونے کے بعد انیسہ اور نعیم کے دفعتاً چلے جانے سے رابعہ نے ایک بھیانک خلاء دُور دُور تک اپنے ارد گرد محسوس کیا تھا۔ انیسہ کے بچّوں سے ملنے کے بہانے اُس نے کئی بار انیسہ کے سسُرال جانے کی کوشش بھی کی تھی مگر اپنی ماں کے حکم کے آگے اُس کی ایک نہ چل سکی۔ پھر ہمیشہ گہرا گاڑھا اندھیرا اُسے اپنے ساتھ ساتھ اور بہت قریب محسوس ہوا تھا۔ اُس کی تمام شوخی اس اندھیرے کی نذر ہو گئی تھی۔ وہ گویا کھوئی کھوئی

سمانے لگی تھی۔ لیکن گردشِ حالات نے جب نعیم کو دوبارہ اُس کے وجود و
لاکھڑا کیا تو خود پر مسلّط اندھیرے کو جھٹک کر رابعہ پھر چوکس اور چاق و چوبند
ہوگئی۔ اُجالا ہی اُجالا بن گئی۔ دونوں کی بجھی ہوئی مسرتیں، سسکتی ہوئی خواہشیں پھر
ریشمنیوں کی طرح دمکنے، لَو دینے لگیں۔ ایک دوسرے کے حضور پیش کرنے کے
لئے دونوں نے اپنی اپنی اُمیدوں کے چراغ پھر جلائے لیکن بھولی رابعہ ــــــ
اس نگرانی اور پابندی سے واقف نہ تھی جو اُس کا نوشتۂ تقدیر بن چکی تھی۔ چور جب
تک پکڑا نہ جائے دھڑلے سے اپنی ایمانداری کا ڈھنڈورا پیٹ سکتا، اپنی جھوٹی
دیانت کا کھوٹا سکّہ وقت بے وقت چلا سکتا ہے۔ مگر جیسے ہی ایک بار چور ثابت
ہو جائے پھر کبھی دیانت اور ایمانداری کا راگ نہیں الاپ سکتا۔ پھر وہ چوری سے
تائب ہی کیوں نہ ہو جائے کہلاتا چور ہی ہے اور ہر ہر فرد گویا از خود اُس کا پہرے
دار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ رابعہ اور نعیم نے بھی بظاہر احتیاط کی انتہا کر دی۔ لاتعلقی
اور بے نیازی کا کامیاب ترین مظاہرہ کیا۔ مگر سخت نگرانی پھر بھی عتاب کی طرح
برابر اُن پر نازل رہی۔ دن اور رات کے جس حصّے میں جتنی دیر نعیم گھر پر موجود
رہتا۔ رابعہ اپنی ماں کے پاس سے ہل بھی نہ سکتی۔ ہزار کوشش ہزار بہانوں پر
بھی کسی دوسرے کمرے، یا حصّہ مکان میں نہ جانے دی جاتی اور رابعہ لاکھ چالاک
مکّار مختاط بنتی، لاکھ ڈھونگ رچاتی اتنی جرأت اس میں پھر بھی نہیں تھی کہ اپنی ماں کو دھوکا
دے جاتی۔

ادھر پوری آزادی کے باوجود نعیم بھی خود کو جکڑا جکڑا سا محسوس کر رہا تھا۔
جیسے نہ دیکھتے ہوئے بھی کوئی اُسے برابر دیکھ رہا ہو مسلسل نگاہ میں رکھے ہوئے
ہو۔ اس صورتِ حال نے اِسے بھی جھلا دیا۔ اگر اپنے ساس سسر کا خوف نہ
ہوتا تو نعیم اس بار اندیشہ کی پرواہ کیے بغیر رابعہ کو پھر فوراً ہی لپک لیتا۔ مگر اپنی

تمام منصوبہ بندی اور سرکشی کے باوجود وہ سسرال میں بے بس سا تھا۔ نظر نیچی رکھنے اور تہذیب و شائستگی کو اختیار کئے رہنے پر مجبور لہٰذا تھک ہار کر وہ ایم اے کا تھیسس لکھنے میں مصروف ہوگیا اور خود کو ناچار گھسیٹتا رہا۔ اُس نے مصلحت اور خود حفاظتی کی خاطر اس موقع پر اپنے خسر کی دلائی ہوئی ایک سرکاری ملازمت بھی بے چون و چرا حاصل کر لی اور آمد و رفت کی سہولت کے پیشِ نظر ایک موٹر سائیکل بھی بلا پس و پیش قبول کر لی اور یوں اپنے سسرالی اثر و رسوخ کو اپنے تحفظ اور سلامتی کی ڈھال کی طرح بڑی مہارت سے استعمال کرنے لگا۔ وہ اپنی موجودہ ملازمت سے نباہ ضرور کر رہا تھا مگر اُسے پروفیسر بننے کی بے حد دُھن تھی۔ تاکہ مستقبل میں زیادہ یکسوئی اور طمانیت سے نوجوان ذہنوں کو جماعتی مفاد کی طرف موڑ اور جھکا سکے۔ اور اپنی ذاتی نارسائی اور تشنگی کا بھی جی بھر ازالہ کر سکے۔ عورت عین عالمِ شباب میں بھی نعیم کی کمزوری نہیں رہی تھی۔ مگر انیسہ کو اپنے جذباتی اور ذہنی سنگھاسن سے اتار دینے اور اپنی ذات کے اُس سنسان ویران غیر آباد سونے پن میں رابعہ سے اچانک ٹکرا جانے کے نتیجے میں پھر اُسے شدت سے احساس ہونے لگا کہ عورت زندگی کے لئے اشد ضروری ہے۔ عورت کے بغیر زندہ رہنا ناممکن، خواہ وہ کوئی بھی عورت ہو، کیسی بھی ہو۔ یوں وفاداری، استواری، سطوتِ کردار نعیم کے کردار کے ہاتھ سے چھوٹ چکے تھے۔ اُس کی ذات سے بچھڑ کر بالکل ہی الگ ہو کر اتنا دُور جا پڑے تھے کہ اب نعیم کا اُن تک پہنچنا ناممکن و محال ہو گیا تھا۔ اب نعیم کو یہی بہت سہل، درست اور دلچسپ معلوم ہونے لگا تھا کہ اپنی ذات کے اُس ٹوٹے ہوئے قیمتی حصے کو اُٹھانے کی تگ و دو کی بجائے سہولت سے ہاتھ آجانے والی چیز پر زیادہ توجہ دے۔ جب، جہاں، جیسا موقع ملے۔ جو کچھ مل جائے اُسے ہی اُٹھا لے، حاصل کر لے۔ کسی چیز کو اپنی ذات کا اہم حصہ بنانے یا کسی کو اپنا

وفا دار رکھنے کے لئے جو سچائی، پاکیزگی اور مضبوطی خود اپنی طرف سے درکار ہوتی ہے وہ نعیم میں باقی نہ رہی تھی اور اپنی طرف سے کسی کو کچھ دیئے بغیر ہی سب سے کچھ نہ کچھ حاصل کر لینا اُسے بھلا لگنے لگا تھا یہ کردار کی کمزوری ہی سہی مگر اب نعیم کو اسکی پرواہ نہیں رہی تھی۔ وہ یہ باور کر چکا تھا کہ قناعت کرنے والے ہمیشہ کمزور اور ناپاس رہ جاتے ہیں۔ لہذا رابعہ کا خواب دیکھتے ہوئے وہ ساتھ ساتھ کئی اور خواب دیکھنے لگا۔ پُرفسوں پُرکار جال بُننے لگا۔ کئی جسموں، کئی چہروں، کئی پری خانوں کو اپنے اردگرد محفوظ کرنے اُن سے جی بھر محظوظ ہونے اور عشرتِ زندگی کو دل بھر کے لگانے کے خواب بلکہ رابعہ کی پیاس ہی پھر نعیم کی وہ ہوس بن گئی جو بیک وقت اُسے کئی کئی خواب دکھانے لگی۔ اور خوابوں کی اس فراوانی اور بہتات میں۔ خوابوں کی آرزو اور انہماک میں نعیم کا وہ شخصی آئینہ خانہ بالکل تباہ و مسمار ہو گیا جو ہر انسان کی شخصیت میں پوشیدہ ہوتا ہے، ہر انسان کا ضروری حصہ ہوتا ہے۔ جسکی مدد سے انسان خود کو سجا اور سنوار سکتا ہے۔ خوبصورت بناتا ہے۔ مگر ہوس کا ایک ہی کاری وار نعیم کے اندر محفوظ سارے شفاف شیشے توڑتا ہوا اُسے طالب کی اُس دگرگوں کی طرف لے چلا جہاں لطیف اور جمیل ساعتیں کسی کی منتظر نہیں ہوتیں صرف گھناؤنے ہلکے ہوتے ہیں اور اندھی خود فراموشی۔

اِدھر نعیم کے اس سارے منصوبے اور اسکیم سے بالکل ہی بے خبر انیسہ پھر ایک بار کسی قدر مطمئن اور پُرسکون ہونے کی کوشش کر رہی تھی مسلسل ہنگاموں کی زد میں پے بہ پے ناخوش گوار واقعات کی یورش سے چھوٹ کر مدت بعد اُس نے نعیم کو تعلیم کے ساتھ زندگی گزارتے دیکھا تو پھر چین کا سانس لیا تھا۔ نعیم کی ملازمت مصروفیت، ماں کی کڑی نگرانی اور رابعہ کی نعیم سے یقینی علیحدگی نے اُسے پھر آیندہ زندگی کی آسودہ جھلک دکھانا شروع کر دی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اب اس

میں اپنی طرف سے بھی کوئی رخنہ یا رکاوٹ ڈالے۔ شاید نعیم بدل جائے۔ یہاں کی پابندیوں میں رہ بس کر وہ خود بھی ایک پابند اور ذمہ دار انسان بن جائے۔ ایسا انسان جو بھلے ہی گھر میں اپنی محبت تقسیم نہ کرے، مگر گھر سے وابستہ تمام افراد کے لئے ایک سرمایہ ضرور ثابت ہو۔

یہ امید لاکھ موہوم سہی مگر انیسہ نے اپنے اندر پیدا کرلی تھی اور اب یہی اُمید اُس کی کل متاع تھی۔ اُس کے مستقبل کی ساری دولت اور عافیت۔

اور آسائش اور آسائشیں! اُس نے سوچا۔ میں ابا سے کہہ کر نعیم کو اتنی زیادہ آسائشیں مہیا کروا دوں گی کہ وہ اپنی جماعت اپنی تحریک، اپنے دوست احباب سب کو بھول جائے۔ وہ خود آسائش کا عادی ہوجائے۔ سہولتوں کے بغیر زندگی نہ گزار سکے اور کون ایسا شخص ہے جو ذاتی آرام اور ملائمتوں سے دیر تک انحراف کرسکے۔ دیر تک خود کو بچا سکے۔ ان کے مل جانے پر بھی خود کو ان سے بیگانہ محفوظ رکھ سکے۔ آسائش تو ایک مقناطیس ہے اور نعیم کو تو اتنی کم سہولتوں نے اتنے مختصر عرصے میں ہی اپنی طرف مائل کرلیا ہے کہ کم از کم اب نعیم ان کی افادیت سے منکر نہیں ہوسکتا۔ ان کی اہمیت ان کے آرام دہ پہلو کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ضرورت اتنی ہی ہے کہ اُسے اُس کی مخصوص مصروفیتوں سے عرصے تک الگ رکھا جائے اور اس تمام عرصے میں زیادہ سے زیادہ سکھ اور فراغت بہم پہنچائی جائے۔ یہی سب سوچ سوچ کر عرصے بعد انیسہ کھلے دل سے ہنس پڑی۔

اور ٹھیک اُس وقت جب انیسہ کھلے دل سے ہنس رہی تھی خود کو ایک خوش آئند اور باعافیت مستقبل کا یقین دلا رہی تھی نعیم نے اچانک نگاہ جما کر عائشہ کو دیکھا۔ عائشہ جو انیسہ کی ماموں زاد بہن تھی اور ایک حادثے میں اپنے ماں باپ کو کھو کر عرصے سے انیسہ کے گھر رہتی آئی تھی۔ جو اب خود اس گھر کا ایک حصہ

بن چکی تھی۔

عائشہ ایک سیدھا سادا چہرہ رکھتی تھی۔ کم گو، کم سخن، کم آمیز تھی۔ کھلنڈرا پن جیسے چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔ جو اپنا زیادہ وقت گھریلو مصروفیات میں یا خاموش کمروں میں لوگوں سے الگ تھلگ کتابوں کے ساتھ گزار دیا کرتی تھی۔ جو خود نہ ہنگامہ تھی نہ باعث ہنگامہ۔ اور جو اپنی مخصوص فطرت کی وجہ سے سارے گھر والوں کو بے حد مطمئن رکھتی تھی۔

عائشہ فوراً ظاہر ہو جانے، نگاہوں میں آجانے والی لڑکی نہیں تھی۔ وہ اس وقت تک صحیح طور پہ پہچانی بھی نہ جا سکتی تھی جب تک اپنے آپ کو خود ظاہر نہ کر دے۔ اس کی شخصیت کے اطراف حسن کا کوئی ہالہ نہیں تھا مگر اکثر خلاف توقع صورتوں میں جب وہ چیزوں یا لوگوں کو زیادہ استعجاب سے ٹٹولتی، نظر جما کے دیکھتی تو اس کی نظروں کی جسارت، اس کے مشاہدے کی قوت، اس کا ادراک، اس کی تمام پوشیدہ پنہاں طراری یکلخت اس کے چہرے پر نمودار ہو جاتی اور فراست کی روشنی میں اس کا سیدھا سادا چہرہ یکایک ایسا گمبھیر، ذہین اور قابلِ توجہ بن جاتا۔ ایسا عیاں اور نمایاں ہو جاتا کہ اس وقت اس چہرے پر پڑنے والی ہر نگاہ خود بخود کوند جاتی، چونک کر جاگ جاتی۔ اس چہرے کو مزید ڈھونڈنے، تلاش کرنے لگ جاتی کہ بادی النظر میں دلفریب، دل آویز، دلکش نہ ہو کر بھی مخصوص حالتوں میں اس چہرے کے خدوخال کچھ ایسی گہرائی، عافیت اور کشش اختیار کر لیتے جو مسحور کرنے کی پوری طاقت اپنے میں اجاگر کر لیتے جیسے خوبصورتی صرف وہی نہیں جو فوراً نظر آجائے۔ نگاہ کو اسیر کرلے جیسے چاند سورج ستاروں، پھولوں، بادلوں، ہواؤں یا شفق افق، چاندنی اور دھوپ جیسی علانیہ خوبصورتی۔ روشنی، رنگینی، شوخی، حسین خوب صورتی جسے ہر کوئی محسوس کرتا اور معترف ہوتا رہتا ہے۔ بلکہ ایک خوبصورتی وہ

بھی ہوتی ہے۔ جو آبادی سے دُور ہنگاموں سے پرے ساحلِ سمندر پر کسی کشتی کے سست خرامی مگر اعتماد سے بہنے کی خوبصورتی ہوتی ہے۔ جو ماہیا الاپنے کی خوب صورتی ہوتی ہے۔ یا کسی ہنس کے تیرنے، کسی گھنے جنگل میں ہرنوں کی ڈار کی کلیلوں کی خوب صورتی ہوتی ہے۔ اُس مور کے رقص کی سی خوبصورتی جو خاموش بنوں میں سہانے موسموں میں ہی رقص کرتا اور خود بے خود ہو کر سارے اردگرد کو وارفتہ بنا دیتا ہے۔ یا اُس شام جیسی بے پناہ گنجلک خوب صورتی جب دن اور رات باہم ملتے اور زمین آسمان۔ ساری کائنات کو ایک حزیں مگر پُر شفق اور پُر تمکین دھندلکے کے سپرد کر دیتے ہیں۔ وہ خوب صورتی جو احساسِ ذوق اور جمالِ نگاہ کے بغیر محسوس نہیں ہو سکتی۔ جو ہرن کے نافے میں چھپے مشک کی سی خوشبو دار اور کمیاب خوبصورتی ہوتی ہے۔ اُس پنہاں جذبے کی طرح نازک اور حساس جو ادائے محبوبیت کی طرح بے ساختہ، اچھوتا، والہانہ سج دھج رکھتا ہے۔

عایشہ کے پاس جذبوں کی بہتات اور فراوانی تھی بلکہ عایشہ سرتاپا جذبوں سے بنی ہوئی تھی۔ وہ اپنے وجود سے کسی کو چونکائے بغیر ایسی گمنام الگ تھلگ نظر آتی جیسے زندگی کا قطعی کوئی کارآمد حصّہ نہ ہو مگر اپنی علیحدگی کے باوجود وہ محسوس کرنے والوں پہ برابر اثر انداز رہتی۔ سب کا خلوص اور محبت بھی صرف اپنے انداز میں قبول کرتی۔ بالکل ویسا نہیں جیسا لوگ خود دینا چاہتے۔ وہ کوئی ایسا کام نہ کر سکتی جسکے کرنے کو خود اُس کا جی نہ چاہے۔ جو خود اُسے پسند نہ ہو۔ یوں عایشہ ایک خاص مزاج کی دُور افتادہ سی ہستی تھی۔ نعیم نے اُسے ہمیشہ سرسری طور پہ دیکھا تھا۔ مگر اب جب نارسا نعیم کی لپکتی ہوئی شدید نظریں ایک خاص انداز میں عایشہ کے پورے وجود پر ٹک گئیں تو نعیم کی نگاہوں میں عایشہ کا ایک بھرپور اور نیا سراپا ابھرنے لگا۔

وہ اپنے چہرے سے زیادہ اپنے جسم میں زندہ محسوس ہوتی۔ جب سے رابعہ

اور نعیم کا راست رابطہ اور واسطہ ختم ہو گیا تھا نعیم برابر بھٹک رہا تھا مگر اب اس غیر متوقع اور خاص لمحے میں جب اُس نے عایشہ کو رابعہ کی جگہ رکھ کر دیکھا تو اُس کی طلب اور ہوس خود بخود بہل گئی۔

نعیم کا خیال تھا رابعہ کی طرح عایشہ کی زندگی میں بھی وہ مرعوب کرنے والے انداز اور الفاظ کے ذریعے داخل ہو گا۔ عایشہ کے نوجوان لطیف احساسات میں بھی ایک خوش گوار کیفیت کو بتدریج جگاتا، بیدار کرتا جائے گا۔ حتیٰ کہ رابعہ کی طرح عایشہ بھی خوشگواری کے پُرکیف چھلک پڑنے والے پیالے سے بلا تامل اپنے ہونٹ لگا دے گی۔ پھر مسرت اور لذت سے مخمور ہو کر خود ایک شراب کی بوتل بن جائے گی۔ خود مچلنے، چھلکنے لگے گی۔ مگر پہلی ہی ارادی گفتگو کے بعد بہت جلد نعیم سمجھ گیا کہ یہ بیل اتنی آسانی سے منڈوا چڑھنے والی نہیں۔ رابعہ تو ریشم کا گولہ تھی، ملائم اور پھسلواں، تیزی سے کھلنے اور سرک جانے والا مگر عایشہ شاید کپاس کی وہ پھلّی جو اپنے وقت پر ہی کھلتی اور خاطر خواہ نگرانی پر ہی فایدہ پہنچاتی ہے ورنہ ہوا کا ایک نامناسب اور تند جھونکا بھی جسے درہم برہم کرنے، دور اُڑا لیجانے کے لئے بہت کافی ہوتا ہے۔ رابعہ ایک نوخیز لچکیلی ڈال کی طرح نرم و کومل تھی جو ہر طرف جھکائی اور موڑی جا سکتی تھی مگر عایشہ ایک بند کتاب، ایک مقفّل مکان جسے کھولا نہیں گیا۔ جس کے اندر پتہ نہیں کیا ہے؟ کتنی دلچسپیاں؟ کیسے اسرار؟

وہ انہیں جاننے بے تاب ہونے لگا مگر وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ عایشہ محض آتش بیانی، لفاظی، شوخ کلامی یا تیز و تند لمس سے حاصل ہونے والی نہیں۔ وہ صرف خوش وقتی کی بازی نہیں اُسے تو تحمّل، استقلال اور دانشمندی کی بساط پر جانسوزی اور فہم سے جیتنا ہو گا۔ اور اُس لمحے کو کبھی نہیں آنا چاہیے جو عایشہ کو چوکنا کر دے۔ جو اُس کے اور نعیم کے درمیان شبہ کا فاصلہ پیدا کر دے تاکہ اُسی کے

انداز میں سمجھنے کی کوشش کرنے لگا مگر ہر کوشش کے بعد عائشہ اُسے مشکل تر نظر آنے لگی۔ وہ کسی طرح مرعوب ہی نہ ہوتی تھی، کسی طرح قابو میں ہی نہ آتی تھی کہ دفعتاً ایک دلگیر ساعت آندھی کی طرح آئی اور سیلاب کی طرح دھاندلی مچا گئی۔ انیسہ کی والدہ نے اچانک زندگی اور دنیا کو خیرباد کہدیا اور اُس رات کی صبح ایک دیوانی کی طرح اس گھر میں نمودار ہوئی۔ جب چیخوں اور کراہوں کا طوفان تھما، ماتم کی آخری جانگسل ساعت بھی گزر گئی تو سارے گھر پہ ایک ایسی شام آئی جو گزری نہیں بلکہ رُکی رہ گئی پھر نہ جانے کتنی صبحیں دوپہریں فقط شام کی اس بے بسی میں ڈھل کر رہ گئیں مگر آخرش یہ شام بھی ڈھلنے گزرنے لگی اور زیست کا تھما ہوا دھارا پھر قانونِ قدرت کے مطابق بڑھنے بہنے لگا۔ ٹوٹے ٹوٹے سہی سارے افراد پھر مہرہ حیات میں اپنا اپنا حصّہ ادا کرنے لگے۔ مگر اس ہنگامے کے بعد جب پژمردہ عائشہ نے اپنی نحیف نڈھال آنکھیں کھولیں تو دنیا اُسے بڑی بیکار اور واہیات نظر آئی۔ ناکارہ ناقابلِ توجہ! اپنے خاندان کے خاتمے کے بعد عائشہ اپنی مہربان پھوپی کو ہی ماں سمجھنے لگی تھی اور انیسہ کی والدہ نے بھی خود اُسے انیسہ، رابعہ سے کبھی کم نہیں سمجھا تھا۔ مگر اب جب وہ بھی ختم ہو چکی تھیں۔ عائشہ نے سوچا ایسی دنیا میں دلچسپی لے کر کیا کرے۔ وہ ہولاتی رہی! ہولاتی رہی! اور اُس کی دگرگوں زار حالت دیکھ کر نعیم یکایک اُس کے بہت قریب چلا گیا۔ "عائشہ"۔ وہ نرمی سے بولا۔ "خود کو سنبھالو۔ تم نے بہت کچھ کھویا ہے مگر دنیا میں یہ سب تو ہوتا ہی آیا ہے۔ ہوتا بھی رہے گا۔ موت زندگی کا لازمی نتیجہ ہے عائشہ۔ مجھے، تمہیں، دوسرے تمام انسانوں کو بھی ایک نہ ایک دن مرنا ہی ہے۔ کون یہاں ہمیشہ رہنے کے لئے آیا ہے۔" اُس نے عائشہ کو تھپتھپایا۔ عائشہ نے بڑے غم، بڑے مستحکم الم نظر اُٹھائی اور نعیم کو دیکھا۔ "مگر......"

"موت کے سامنے اگر مگر کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مضبوط بنو۔ بدترین صدمات کی آگاہی کے لئے خود کو ہمیشہ تیار رکھو کہ جب تک وحشت، دہشت اور درد ناکی کا مقابلہ نہ کیا جائے، کوئی بھی زندگی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ تسلّی اور سکون جو گمشدہ یا ناقابل حصول چیزوں سے دوری اور صبر کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح پیدا ہو سکتا ہے"

عائشہ خاموش آنسو بہاتی رہی۔

نعیم نے اپنے رومال سے اُس کے آنسو پونچھے۔

"ٹھیک ہے آنسو ضرور بہاؤ مگر آنسوؤں کی قیمت بھی سمجھو۔ آنسو بھی دل کی زبان ہوتے ہیں، عائشہ مگر آنسو بھی کب تک۔ میری بات مانو اپنی توجہ پھر کتابوں کی طرف پلٹاؤ۔ خوب پڑھو، اتنا کہ زندگی کی کوئی گتھی اور دنیا کا کوئی گوشہ تمہاری نظر سے بچ نہ جائے۔ ہر واقفیت تمہارا حصّہ بن جائے!"

"مگر مہربان ہستیوں کو کھو کر اب تو مجھے کتابیں بھی اچھی نہیں لگ رہی ہیں۔ میں شاید ان کی بے ثباتی سے بھی خوفزدہ ہوں نعیم بھائی۔ کیونکہ اگر زندگی کا یقینی انجام صرف موت ہے تو پھر علم کی انتہا بھی صرف لاعلمی ہوگی۔ صرف لاعلمی ــــ"

"پھر بھی وقت سے پہلے کوئی مر نہیں سکتا عائشہ! اور زندگی گزارنے کے لئے کوئی نہ کوئی مصروفیت ضروری ہے ــــ" لیکن نعیم کی تمام ہمدردانہ جذباتی ملائمیت اور امید افزا گفتگو کے باوجود عائشہ کی دگرگونی بڑی بے کیف یکسانیت لئے رہی۔ اُسے ساری دنیا لُٹی لُٹی محسوس ہوتی رہی ایسے میں اچانک نعیم کو ایک اور ترکیب سوجھ گئی۔ مضطرب و منتشر عائشہ کے سدھار کی ایک یقینی ترکیب۔ اُس نے چند کاغذات اور قلم عائشہ کو تھما کر کہا: "تم اب تک صرف پڑھتی رہی ہو مگر اب اپنی تمام سوچ، تمام خیالات قلمبند کرنے لگو عائشہ۔ اس سے تمہارے

دل، دماغ کو سکون بھی ہو گا اور وہ روحیں بھی انہیں پڑھ سکیں گی جو اگرچہ بولتی نہیں، دکھائی بھی نہیں دیتیں۔ مگر موجود ہوتی ہیں اور سب کچھ محسوس کر سکتی ہیں۔ اپنے چاہنے والوں کی ہر ہر حرکت۔"

اور یہ ترکیب کچھ ایسی کارگر ہوئی کہ پھر عائشہ اسی خیال کو مضبوطی سے اپنے ذہن میں جکڑے یکا یک زندگی کی طرف پیش رفت کرنے لگی۔ اپنا غم کاغذات پر بکھیرنے لگی۔

جسم اور روح کے رشتے یا جسم کی بربادی اور روح کی برقراری کے بارے میں اُس نے کبھی نہیں سوچا تھا مگر اب کسی قوی قوت اور گمبھیر احساس کے تحت وہ سوچنے لگی اور اسی عنوان کچھ آرزوئیں، خواہشیں۔ کچھ روشن رونق پھر اُس میں جاگنے، جگمگانے لگی۔ سوئی سوئی سی مضمحل عائشہ پھر جاگ کر اپنے سونے پن سے آمادۂ پیکار ہونے لگی۔ نعیم اُس کی تحریریں وقتاً فوقتاً پڑھ لیا کرتا تھا اور، اُس مشاہدۂ حیات، جولانیٔ طبع، اُس کی احساساتی بوقلمونی اور صداقت پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا مگر وہ عائشہ کی صحیح رہبری اور رہنمائی نہ کرنا چاہتا تھا۔ اُس کی شکستہ ذہنی کو اس طرح اپنا اسیر رکھنا چاہتا تھا کہ عائشہ اُس کے علاوہ کوئی اور سہارا نہ محسوس کر سکے۔ اُسے حاصل ہوئے بغیر کسی اور کو نہ حاصل ہو جائے۔ رابعہ آسانی سے حاصل ہوئی آسانی سے چھوٹ بچھڑ گئی تھی مگر عائشہ جس محنت و کوشش کے بعد اُسے ملنے والی تھی اس کا یہی تقاضہ تھا کہ پھر وہ چھوٹتے چھوٹتے بھی عائشہ کا کچھ نہ کچھ قیمتی حصہ بطور نذرانہ ضرور اپنے ساتھ لے لے چنانچہ دانستہ اور شعوری طور پر وہ عائشہ کو مشکل اور گمبھیر مسائل کی طرف لے جانے لگا۔ تاکہ ایک بھی اور تکلیف دہ مسافت طے کرا کے، ایک طویل اور پیچیدہ گذرگاہ سے گھما، پھرا کے تھکی ماندی عائشہ کو اُس کھڈ میں یقینی طور پر پہونچا دے، جو اُس نے بڑی

ہوشیاری اور مہارت سے اُس کے لئے تیار رکھا تھا۔ ویسے عائشہ کے اندر دنیا
میں اپنی تمام پچھلی زندگی جلی حرفوں کی طرح موجود ضرور تھی اور ذہن کے کسی مضبوط
مربوط گوشے میں اس کا اپنا تمام حوصلہ نڈر پن، عزم و اعتماد جرأت و استقلال بھی جو
مناسب ترین فیصلے کرنے کا اہل اور خوگر رہا تھا۔

مگر ادھر کچھ عرصے سے وہ نعیم کے لئے ایک انوکھا جذبہ بھی بڑی اپنایت
سے اپنائے۔ خود میں شامل کرنے لگی تھی۔ ایسا جذبہ جو مرد، عورت کے تصادم کا
نتیجہ نہیں تھا بلکہ صرف خلوص کا رہین منت اور درد شناسی کی کوکھ سے پیدا ہوا
تھا۔ نعیم کے خلوص سے متاثر مگر اُس کے اندرون سے بے خبر وہ اُس کے قریب تر
پہنچ چکی تھی چنانچہ ایک شام عائشہ کو حد سے زیادہ ملایم اور اپنا تابع پاکر نعیم نے
نہایت انوکھے انداز میں اُس سے کہا:

"تمہیں تو اپنی زندگی کے لئے صرف اینٹ پتھر چونے گارے کا گھر نہیں
بلکہ دل کی نازک اور بیش قیمت چہار دیواری چاہیے عائشہ۔ کیونکہ تم جیسی حسّاس
لڑکی کا اصل گھر تو کسی مرد کا چاہت بھرا دل ہی ہوسکتا ہے فقط"

"شکریہ ——" عائشہ مُسکرائی۔

"اور تمہیں تو محبت کا ایک پورا سمندر ہی چاہیے۔ بند کوزہ یا مختصر ندی نالے
چشمے سے تمہاری سیرابی یا آبیاری ممکن نہیں ہے نا ——؟"

"شاید ——" عائشہ نے کہا۔

"شاید نہیں یقیناً عائشہ لیکن کسی مرد کا محبت بھرا دل تم اُس وقت
تک نہیں پاسکتیں جب تک خود اُس مرد کو نہیں پالیتیں۔ جب تک مرد اور عورت
کا صحیح رشتہ تمہاری سمجھ میں نہیں آجاتا۔ کیا تم مجھے اس بات کی اجازت دوگی کہ میں
وہ خوب صورت رشتہ تمہیں سمجھا دوں؟"

عائشہ پشیمان ہونے لگی کہ اُسے رشتوں کی نوعیت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ
اور علم بھی نہیں۔ مگر فرطِ مسرت سے نعیم لہرا گیا۔ جھوم گیا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اس
زدہ ذہن، نازک ہیولے کو جیتنے کا وقت آ گیا۔ اُسکے کسی اعتماد و یقین کو درہم
برہم کئے بغیر کسی خواب یا خیال کو پاش پاش کئے بغیر اپنی تمام خوش آیند توقعات
کو تباہی یا غارت گری کے قریب لے گئے بغیر اب وہ اسے بلا تامل حاصل کر سکتا ہے
اب وقت آ گیا ہے کہ وہ عائشہ کو جسمانی اتصال کا مزہ چکھا دے۔ گلزارِ حیات
اور گلشنِ شباب کی گلگشت اور سیر کرا دے۔ تب عائشہ کی باہیں پھولوں کے ہار
بن کر اُسے اپنے شوق کے گلے میں حمایل ہوتی محسوس ہوئیں۔ آناً فاناً ایک ادائے
دلرُبائی سے وہ آگے بڑھا۔ ایک دلکش جُنبش سے جُھکا اور ملامت سے کھینچ کر
اُس نے عائشہ کو لپٹا لیا پھر آہستگی مگر عجلت اور چابکدستی سے اُس نے اپنے مشتاق
لرزاں ہونٹ عائشہ کے ہونٹوں پر پھیر دیئے۔ اُس کے نوخیز جسم کو نرمی سے
ٹٹولنے، سہلانے لگا۔ ان ہونٹوں کے ساتھ اگرچہ نعیم نے رابعہ جیسی شرارت
نہیں برتی۔ رابعہ والی دیوانگی اور درندگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انہیں دیر تک جکڑے
نہ رکھا۔ وہ وحشت اور بہیمیت بھی نہ برتی جو رابعہ کی خود سپردگی سے مغلوب ہو کر
پہلی مرتبہ ہی اُس کے ساتھ برت ڈالی تھی بلکہ ان ہونٹوں کو تو وہ پوری احتیاط، اور
دانائی سے ممکنہ آہستگی اور حلاوت سے بالکل گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح چوم رہا تھا۔
انسانیت، سلیقے اور طرب سے مس کر رہا تھا۔ مگر عائشہ ایک فوری جھٹکے سے علیحدہ
ہوئی اور بھر کر پوری طاقت سے اُس نے نعیم کو پرے دھکیل دیا۔ عائشہ کے
نسائی غرور کو محسوس کرکے، کوفت اور پشیمانی سے فوراً سنبھل کے نعیم ایک مرد
کی شدید خونخواری اور حیوانیت سے شدتِ جوش اور غیظ و غضب سے
عائشہ پر جا پڑا۔ اُسے یقین ہونے لگا کہ عائشہ زبردستی کے سوا قابو میں نہیں آ سکتی۔

لہذا منٹوں میں فیصلہ کرکے اُس نے دروازے کی کنڈی چڑھادی۔
دہشت و ہیبت عائشہ کو پسپا کرنے لگی مگر قبل اس کے کہ نعیم اُسے بالکل
ہی عریاں کر دیتا۔ اُس نے بھی اپنی تمام طاقت اکٹھا کرکے اپنی کمزوری اور خوف
بھول کے۔ پوری بے رحمی اور بربریت سے نعیم کے ہاتھ چبا ڈالے اور ناقابل قیاس
عجلت دہشت سے پاگلوں جیسے جنون سے نعیم سے بچ کے کنڈی اُتار کر سرپٹ باہر
بھاگی۔ ہانپتا، تاؤ پیچ کھاتا ہوا ششدر نعیم دیوار سے ٹکا اپنے ہونٹ کترتا ہاتھ
سہلاتا رہ گیا۔ جب عائشہ نے اُسے دھکیلا تو وہ ایک چوٹ زدہ لڑکی کی مدافعتی
قوت سے واقف نہیں تھا۔ مگر جب خالی کمرے میں بستر کی بے معنی سلوٹیں نعیم
کی پسپائی کا مضحکہ اُڑانے اس کا منہ چڑانے لگیں اور ایک نہیں لمس اُسے زیادہ
وارفتہ و مجنوں کرنے لگا تو ناکامی نے بے بس نعیم کو سانپ کی طرح ڈس لیا۔
نہیں ۔۔۔ اُس نے خود سے کہا۔ میں اپنا تحمل اپنی کوشش اپنی جدوجہد ہرگز،
رائیگاں جانے نہ دوں گا۔ میں اُسے چکنا چور پامال کئے بغیر نہ رہوں گا۔ تب اپنی
بے عزتی ہتک اور توہین کا پورا پورا بدلہ لینے وہ ایک چیتے کی سی عیاری اور پھرتی
سے دوسرے ناقابل قطع حملے کے لئے خود کو تیار کرنے، اپنے حواس درست کرنے
لگا۔ بگڑے ہوئے چہرے پر سے ناکام شکاری کے تاثرات مٹانے، اپنی برہمی اور
درشتگی کو دور کرنے وہ فوراً ٹھنڈے شاور کے نیچے جا کھڑا ہوا اور کچھ وقفے کے بعد
جب حیوان سے انسان بنا تو بے پروائی مگر احتیاط سے کمرہ کمرہ عائشہ کو کھوجتا
پھرا۔ لیکن عائشہ پھر اُسے کسی خالی کمرے میں نظر نہ آئی۔ وہ تو انیسہ کی کمر میں ہاتھ دیئے
سسکیاں بھر رہی تھی اور سراسیمہ انیسہ حیرت سے سوچ رہی تھی کہ، بھلی ہوئی عائشہ
پھر اس شدت سے کیوں رونے لگی ہے۔ وہ عائشہ کی صحیح کیفیت سمجھ نہ سکی مگر
صرف عائشہ جانتی تھی کہ اُس کے وجود [illegible] شگفتگی سے [illegible] ہوئے پھول اُن کی اُن

میں کچلے روندے جاکر پھر کیچڑ میں لت پت ہو چکے ہیں۔ بے حساب مخلص جذبے پھر پامال
پشیمان اور تار تار ہو چکے ہیں۔

پھر مرد سے عائشہ کو دفعتاً گھن اور نفرت ہو گئی۔ نعیم اپنی شخصیت کی بلندی
اور رفعت سے اپنے عروج اور اوج سے، ایک ہمدرد صایب الرائے مزاج شناس
باعلم آدمی کی اونچی اور عمدہ جگہ سے لڑھک کر یکلخت اُس گڑھے میں جا پڑا جو غلاظت
اور گندگی سے پُر، عفونت اور تیزاب سے بریہ تھا۔ جسے دوبارہ دیکھنا بھی عائشہ
کو گوارا نہ تھا۔ اب عائشہ کی دانست میں نعیم بھی اس گڑھے کا ایک غلیظ حصّہ بن چکا
تھا۔ ناگزیر طور پر ناقابلِ اعتبار ہو چکا تھا۔ وہ رہ رہ کے اپنے ہونٹوں پر کڑواہٹ
اور چھپن محسوس کرتی اور نجات پانے کے لئے بار بار اپنے ہونٹ رگڑتی، مسلتی۔
انہیں صاف پانی سے دھو دھو کر آتی مگر احساس ناپسندیدگی اُسے برابر یاد دلاتے
جاتا کہ اب وہ محفوظ نہیں تب نفرت کراہت اور خوف کے بے شمار حشرات الارض اُس
کے جسم پر رینگنے لگ جاتے۔ اُس کے تمام نفیس اور لطیف احساسات کو اپنی کھُردری
نوکیلی ٹانگوں سے کھریچ کھریچ ڈالے۔

اب وہ کیا کرے — کیا —؟

سوچ سوچ کر اُس نے ایک حل نکالا اور مستقلاً اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔
سارا دن وہ بند کمرے میں گزارتی اور ہر رات چھوٹی بچی کی طرح انیسہ کی کمر میں مضبوطی
سے اپنے ہاتھ ڈال کر سوتی۔ اس طرح اُسے نیند نہیں آتی اور خود انیسہ بھی حیران
ہو کر پے بہ پے سوالات کر ڈالتی مگر اب ہر سوال کا عائشہ کے پاس بس ایک ہی جواب
تھا کہ اکیلے میں اُسے ڈراونے خواب پریشان کر رہے ہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے بھیانک
بدہیئت بھوت پریت اور اُجاڑ آسیبوں کے خواب۔ انیسہ اُس کے خوابوں پر
خوب ہنستی تھی۔ "پگلی تو نے کبھی بھوت پریت، آسیب دیکھے بھی ہیں جواب خوابوں

میں ان سے ڈرنے لگی ہے۔ مگر وہ اپنی ہی ضد پر قائم رہی۔ تب انیسہ نے ہنس ہنس کر نعیم کو بتایا کہ عائشہ کس طرح ڈر گئی ہے اور اب مستقلاً اُس کے پاس ہی سونے لگی ہے۔ نعیم خاموشی سے سنتا، انگاروں پر لوٹتا رہا۔ اچھا تو اب عائشہ یہ چالاکی کر رہی ہے۔ انیسہ کی اوٹ میں چھپنا بچنا چاہتی ہے۔ مجھے بھوت ٹھہرا رہی ہے۔ مگر میں اُسے بخشوں گا نہیں۔ جس مکّاری سے اُس نے مجھے ٹھگا ہے اس کا تو پورا پورا حساب چکاؤں گا۔ اور تب کچھ ہی دن بعد نعیم نے انیسہ سے کہا:

"اب گھر واپس چلو انیسہ۔ ہمیں عمر بھر یہیں تو نہیں رہ جانا ہے۔"

یہ یکایک گھر جانے کی کیا سوجھی اور وہ بھی ایسے نازک وقت......

انیسہ نے تعجب سے نعیم کو دیکھا اور اُس کی حیرت پڑھ کر نعیم بولا: "ہم بہت رہ چکے ہیں یہاں۔ آخر کب تک رہتا۔ میں اس یکساں زندگی سے تھک گیا ہوں۔ کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر چاہو تو کچھ دن بعد پھر آجانا مگر اب چلی چلو۔"

"کیا کچھ دن اور صبر نہیں کیا جاسکتا؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ میں جانتا ہوں موجودہ حالات میں تمہیں یہاں اپنی موجودگی بہت ضروری معلوم ہو رہی ہے۔ مگر جب تم یہاں سے ہٹ جاؤ گی تو خود دیکھ لو گی کہ اس گھر کی زندگی تمہارے بغیر بھی گزر سکتی ہے۔ بلکہ بہت جلد اپنے معمول پر آجاتی ہے۔ بس اب تاخیر نہ کرو۔ روانگی کی تیاری شروع کردو۔" انیسہ نے نعیم کا عزم محسوس کر لیا۔ وہ ضد کر کے تماشہ بننا نہیں چاہتی تھی۔ نہ نعیم کا یہ رُخ کسی کے سامنے لانا چاہتی تھی۔ اُسے اپنی بے بسی بیچارگی کا چرچا قبول نہ تھا۔ امّی کی بات جدا تھی۔ لیکن انیسہ نہیں چاہتی تھی کہ ابّا کو بھی کبیدہ خاطر کرے لہذا آنسو پی کر اور درد برداشت کر کے اُس نے عائشہ سے کہا:

"بعض ضروری وجوہات کی بنا پر اگر میں جلد از جلد اپنے سسرال لوٹ

جاؤں تو کیا میرے غیاب میں تم سب سنبھال لو گی عائشہ۔ تم خود سنبھلی ہوئی رہ سکو گی؟ مجھے بتاؤ مجھ سے وعدہ کرو۔"

"مگر آپ یکایک کیوں جانا چاہتی ہیں؟ یہاں آپ کو کیا تکلیف ہے باجی۔ ہمیں اکیلا چھوڑ کر مت جایئے! مت جایئے!!"

"لیکن کوئی ایسی ہی مجبوری ہو کہ میں رُک نہ سکوں۔ جانے پر مجبور ہی ہوں تو کیا تم مجھے معاف نہ کرو گی۔ معاف نہ کرو گی عائشہ۔ میری پیاری بہن!؟"

"باجی! باجی!!" عائشہ نے انیسہ کی آنکھوں میں جھانکا اور وہاں نمناکی گرد و غبار ایک گڈمڈ الم اور بےکسی کو پہچان کر بڑے تہہ دار دکھ مگر صبر و استقلال سے بولی: "تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ جتنا میرے اختیار میں ہو گا میں کر گزروں گی"

"شاباش!" انیسہ نے اُسے سینہ سے لگا لیا۔ "رابعہ کے ساتھ ساتھ رہنا۔ خود ابّا کو ایک بچہ کی طرح محسوس کرنا اور اپنے آپ پر بھی نگاہ رکھنا۔ کیونکہ خود کو درست رکھے بغیر تم کسی اور کو درست نہیں کر سکتیں۔ کسی پر حکمرانی نہیں کر سکتیں، لمحہ بھر کے لئے انیسہ خلاؤں میں گھورنے لگی اور عائشہ نے بھی نگاہ جھکا کر آسمان کو دیکھا جیسے غیبی طاقت سے پوچھنا چاہتی ہو کہ یہ سب کیا ہے؟ کیوں آخر؟ اُس کے خاموش درد نے کوئی آہ و زاری نہیں کی۔ کوئی نالہ و شیون، گریہ و ماتم نہیں کیا۔ بلکہ اس گفتگو کے بعد دونوں غمگسار ذہنوں کے درد سنبھل گئے، دونوں کی ڈھارس بندھ گئی کیفیتیں بدل گئیں۔ دونوں خود بخود سب کچھ برداشت کر لینے کے قابل و تیار ہو گئیں اور انیسہ نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ جب انیسہ کی روانگی کا لمحہ آیا تو ایک بار عائشہ نے سوچا نعیم کی جسارت کا حال انیسہ سے کہہ ہی دے۔ مگر پھر اُسے اپنا یہ خیال خود بڑا اوچھا ذلیل اور بیہودہ محسوس ہوا۔ ضرورت پڑنے پر وہ خود بھی تو اپنی صفائی اور بیگناہی کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتی کوئی چشم دید گواہ یا زبان

اور ایسے کسی سلسلہ میں ماخوذ ہونا مناسب نہیں جو خود اُس کی ذلت اور توہین کا باعث ہو۔ خود اُس کی صفائی ستھرائی پر حرف لاتا ہو۔ لہٰذا پھر عائشہ بالکل ہی خاموش رہ گئی۔ مگر اس واقعے کے بعد عائشہ کی تحریری مصروفیت بھی بالکل دم توڑ گئی۔ ابھی اندرونی جانکاہی سے مزید گداز، مزید صداقت، مزید آگہی اور حقیقت حاصل کرنے کی بجائے وہ نعیم کے اُلجھاوے کا شکار ہو کر بے راہ ہو گئی۔ جاننے اور الجھنے معاملاتِ حیات میں اٹک کر پھنس کر صحیح اور غلط ایسے سوال بن گئے جو عائشہ کے صاف اور صریح ذہن کو۔ اُس کی خود اعتمادی اور فکر کو جھٹکے پہنچانے لگے اور دفعتاً وہ حد سے زیادہ ناقابلِ فہم ہستی بن گئی۔ جب سے نعیم کی ذات شک و شبہے کے دائرے میں آ چکی تھی۔ عائشہ ہر خیال کو مشکوک اور اپنی تمام سوچ کو متزلزل پا رہی تھی۔ ذرا فرصت و سکون سے وہ ابتدا سے لے کر اس وقت تک کے تمام حالات کو از سرِ نو پرکھنے جانچنے کی خواہشمند ہو گئی تھی۔ نعیم کے رویّے اور اس کے تضاد کے بارے میں سوچ کر وہ بڑے زور سے کانپتی، اُسے اپنے ذہن میں چونے کی بھٹی کے پکنے۔ دلدل کے اُبلنے کا قطعی احساس ہوا بیچ در بیچ بھنور کی گہرائی منجدھار کی خوفناکی اور خود اپنی اندھا دھند غرقابی کا واضح احساس۔ وہ نعیم کی دوہری شخصیت کو پہلی بار وضاحت و صراحت کے ساتھ محسوس کرنے کے قابل ہو سکی لیکن وہ یہ سوچ سوچ کر حیران ہونے لگی کہ کیوں اور کس لئے نعیم ایسا بنا۔ کس بات نے اُس کے ذہن میں ایسی غیر اخلاقی ناشائستہ حرکت کے لئے راہ بنائی، گنجائش نکالی۔ اُسے اتنی غیر مہذب افسوسناک حرکت پر مائل و راغب کیا۔ وہ جتنا جتنا سوچتی پریشان ہوتی جاتی۔ بے حد ذہن لڑانے کے باوجود عائشہ کوئی ایسی وجہ نہ پا سکی جو اس ساری افتاد کا باعث معلوم ہوتی۔ اپنی تمام زیرکی اور ہوشیاری کے باوجود وہ نعیم اور انیس کے درمیان کی اُس دوری اور

خلیج کو نہ دیکھ سکی جو اُن کی ظاہری زندگیوں کو بے حد مربوط اور خوشنما بناتے ہوئی تھی مگر اُن کی باطنی زندگیوں کو بے حد علیحدہ اور غیر مربوط کر چکی تھی۔ عائشہ قطعی اُس خلا تک نہ پہنچ سکی جو انیسہ اور نعیم کے درمیان نہایت گہرا ہو چکا تھا جو ایک بظاہر اور باہمی سمجھوتا تھا۔ تاہم نعیم کے چلے جانے سے عائشہ کو وہ آرام اور آزادی ضرور مل گئی جو نعیم کی موجودگی کے خوف نے سلب کر لی تھی۔ مگر جو زندگی کی گھٹن اور ابتری سے لڑنے کے لئے اُسے بہر حال درکار و مطلوب تھی۔

نعیم کا خیال تھا کہ اپنی سسرال سے رخصت ہو کر عائشہ کو انیسہ کے سائے سے محروم کر کے وہ اُس کے نیم جاں احساس پر ایک بھرپور تازیانہ لگائے گا۔ ایک کاری چوٹ پہنچائے گا اور یوں عائشہ سے انیسہ کی قربت اور سہارا چھین کر اُس کی تنہائی، بے بال و پری کو اپنے حصول کا موقع اور مناسب ذریعہ بھی بنا سکے گا۔ لہٰذا انتقام کی تمنا اور اپنی ہوس ناکی کی تکمیل کے لئے نہ اُسے اپنی سفاکی کا احساس ہوا نہ بے رحمی کا افسوس۔ بلکہ وہ تو بالکل خوش اور بے فکر ہونے لگا کہ اب اُس کا راستہ ہمیشہ کے لئے صاف ہموار اور غیر دشوار ہوتا جائے گا۔ انیسہ کے ذہن کو متزلزل بدظن زہر آلود کر کے وہ اپنے منصوبے میں مکمل کامیابی حاصل کر سکے گا۔ بے اعتباری، نفرت رقابت اور آپسی پھوٹ کے ذریعہ اپنے لئے ایک ایسا پُل تعمیر کر سکے گا جو خوب مضبوط اور پائیدار ہو۔ جس پر بے فکری اور اطمینان سے چل کر وہ اپنی ذاتی آسودگی اور سرخ روی کا یقینی اور دائمی بندوبست کر لے گا۔ اُس مستقبل کی طرف لپک جائے گا جو اُس نے اپنے لئے پہلے ہی سے تیار کر رکھا ہے۔ جو شاندار ہے۔ چنانچہ اپنے گھر پہنچ کر وہ اپنے اجتناب و تنفر، اپنی طبیعت کے برخلاف انیسہ سے بڑی محبت اور ملنساری سے پیش آنے لگا۔ اُس کے صدمہ کے احساس کو ابھار ابھار کر اُس کی دلداری کرنے لگا اور چند روز بعد ایک دن متانت سے بولا:

"ہوسکتا ہے انیسہ کہ تمہیں میرا رویہ بڑا ناہموار اور وحشیانہ محسوس ہوا ہو اور میں اچھا نہ سہی برا ہی مگر میں تمہارا دشمن تو نہیں۔"

"اب کیا ہوا؟" بات انیسہ کی سمجھ میں نہ آئی۔

"بات کوئی غیر معمولی یا خاص نہیں۔ ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ پھر بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہوں یا نہیں۔ کہنا درست بھی ہوگا یا نہیں۔

انیسہ بے قرار ہوگئی "صاف صاف کہو۔ ہمیں کیوں بنا رہے ہو؟"

"بے شک میں نے تم پر سختی کی ہے۔ لیکن اس کی بھی وجہ اور غرض و غایت تھی میں تمہاری تشکیل و تعمیر چاہتا تھا۔ میں تم میں خامیوں کی کمی اور خوبیوں کی زیادتی چاہتا تھا۔ اگر مجھے تم سے خلوص نہ ہوتا تو اس سارے بکھیڑے کی ضرورت ہی نہیں تھی سخت بننے کی بجائے تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ کر میں بھی اپنی روش اور زندگی میں مگن رہتا خود بھی خوش رہتا۔ تمہیں بھی ناخوشی کا احساس نہ ہونے دیتا۔ لیکن۔۔۔۔

وہ بات ادھوری چھوڑ کے نظر جما کے انیسہ کے چہرہ کے اُتار چڑھاؤ کا جائزہ لینے لگا۔

"اوہ! میں اب انتظار نہیں کرسکتی۔ اصل بات کی طرف آجاؤ نعیم" انیسہ نے متوحش ہو کر کہا۔

"شاید تم برا مان جاؤ۔ میری اس کڑوی مگر سچی بات کو نری الزام تراشی سمجھ بیٹھو۔ مگر اصل بات اتنی ہی ہے انیسہ کہ تمہاری بہنیں قابلِ بھروسہ نہیں، مخلص نہیں۔"

"نعیم!" انیسہ چلائی۔ "یہ کہتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"کیا میں خود اُن سے واقف نہیں۔"

"میں جانتا تھا تم یقین نہیں کروگی مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ حقیقت ہے۔ پہلے رابعہ نے مجھے رجھایا تھا۔ پھر عائشہ نے بھی یہی کوشش

شروع کر دی۔ یہ کہتے ہوئے میری اپنی زبان خراب اور بدمزہ ہوتی ہے۔ مگر میں تمہیں بے کراسی لئے یکایک لوٹ آیا کہ حالات بد سے بدتر نہ ہو جائیں۔ تمہیں مجھے مزید نہ الجھاؤ یں۔"

"نہیں!" انیسہ چلائی۔ "میری بہنیں ایسی نہیں وہ ایسی کبھی نہیں ہو سکتیں" انیسہ نے وثوق سے کہا۔

اور نعیم ہنسا۔ بڑی طنزیہ بڑی بامعنی ہنسی۔ "دُنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ کچھ ناممکن نہیں۔ مگر خیر میں اب کچھ اور نہ کہوں گا۔ میرا کچھ کہنا لاحاصل ہی ہے۔" وہ کروٹ بدل کر سونے کی تیاری کرنے لگا۔ اور نادان عورت شاطر مرد سے پھر دھوکا کھا گئی۔ اپنی ، ناقوی ترین مدافعت کے باوجود لپیا اور قائل ہونے لگی۔ انیسہ اس بات کو نہ ماننا نہ قبول کرنا چاہتی تھی مگر شک۔ وہ بھی جذبہ رقابت کا شک۔ سنبھلنے کی اجازت مہلت دیئے بغیر تیز نوکیلی دھنس جانے والی سوئی کی طرح فوراً اسے چھید نے زخمی کرنے لگا۔ کیونکہ متنفر سے متنفر عورت بھی اپنے نامعقول نالائق ناپسندیدہ شوہر کو اس وقت جی جان سے چاہنے اور پسند کرنے لگتی ہے۔ جب کسی دوسری عورت کی نگاہ اس کے شوہر پر پڑتی، اُسے پسند کرتی ہوئی محسوس ہوتا ہے۔ بیزار سے بیزار عورت بھی ایسی صورت میں اپنی چیز کا تحفظ چاہتی ہے۔ تو کیا واقعی نعیم سچا اور اس کی سمجھ غلط ہے؟ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ بے شک رابعہ سادہ لوح ناسمجھ ہے نادانی میں سب کچھ کر سکتی ہے۔ بچپن میں اُسے مار سکتی، خود ماری جا سکتی ہے۔ مگر سمجھدار عائشہ کسی خول میں چھپی کیا اتنی ناقابل شناخت ہے؟ انیسہ دیر تک کشمکش میں مبتلا رہی۔ وہ ہرگز یقین نہ کرتی اگر اپنی مختصر زندگی میں کئی قاتل اور خلاف امید دھوں اور حادثوں سے نہ گزر چکی۔ چنانچہ اس موقع پر اس کی مدافعت دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ خود کو نہ منوا سکی۔ شک کی زد میں آ کر اس کی برسوں کی پائیدار اور مستحکم محبت

نعیم کے ماہر مہرے سے شطرنج کے "پیادے" کی طرح پٹ کر دفعتاً بساط سے الگ ہو گئی۔ گراہی کا کالا چشمہ اُس کی روشن آنکھوں پر منٹوں میں چڑھ گیا۔ پھر لامحالہ ہر چیز کالی نظر آنے لگی۔ حسد کی آنکھیں کھُلتے ہی دل دماغ کی آنکھیں بند ہو گئیں اور اس گفتگو کے بعد نعیم تو کب کا سو بھی گیا، مگر انیسہ کی نیند پھر اُڑ گئی۔ وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتی رہ گئی۔ ہائے! کیا اسی لئے اُس نے رابعہ کو اس قدر چاہا تھا۔ عائشہ کو اتنا عزیز رکھا تھا، تب ایک نئی طرح کے آنسو انیسہ کی آنکھوں میں آئے اور اُس نے فیصلہ کیا اب وہ ملنے کے نہیں جائے گی۔ ابا کی فکروں، پریشانیوں میں اضافہ نہیں کرے گی۔

اور دونوں اُس کے نہ آنے پر جب ابا خود اُسے لینے آئے تو انیسہ نے خوش اسلوبی سے انہیں ٹال دیا۔ ہر ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ لیا۔ اور جب جب رابعہ، عائشہ خود اُس سے ملنے آئیں تو ایسی کوری اور سرد مہر بن گئی کہ دونوں حیران پھر آنے کی ہمت نہ کر سکیں، یوں ایک علیحدگی۔ شدید جذباتی، احساساتی دوری، کربناک اور بعید فاصلہ ان بہنوں کے درمیان اچانک جگہ بنا کر پھیل گیا، بڑھنے لگا۔ رابعہ اس بے رخی کو سمجھ نہ سکی مگر عائشہ کھٹک گئی۔ بے شک غلط فہمی پیدا ہو سکتی، پیدا کی جا سکتی ہے۔ مگر انیسہ اتنی محبت کرنے والی بہن کیا اپنی بے لوث محبت، اپنے ہمیشہ کے حق و اختیار کو استعمال کر کے اپنائیت اور وقار سے سب کچھ اگلوا نہیں سکتی۔ اُس کا غیر بن جانا کتنا تکلیف دہ ہے۔ ایسے میں اُسے بھی کیا ضرورت پڑی ہے کہ وضاحت، صراحت پیش کرتی پھرے عائشہ نے سوچا اور دن بڑی اداسی کے ساتھ گزرنے لگے یہاں تک کہ رابعہ کے بیاہ کی بات ٹھہر گئی اور اس موقع پر مجبوراً جب انیسہ آئی تو اُن کا انداز ہی نرالا رہا۔ اُسے صرف نعیم کی اور اپنے بچوں کی فکر رہی۔ اُس نے عائشہ کو پلٹ کر بھی نہ پوچھا۔

رابعہ کی حالت سخت غیر تھی۔ نعیم سے واقفیت اور چاہت کے بعد اپنی بہن

آرزو کی رفاقت نے اُس کے ذہن و دل اور پسند و طلب کے وہ سارے خانے بند اور پُر کر دیئے تھے جو ہر لڑکی کا خاص حصّہ ہوتے ہیں اور پھر کسی اور ساتھی کے لئے دوبارہ کھُلنے، از سرِ نو پُر ہونے کے قابل نہیں رہتے۔ کسی کی پذیرائی کی تمنّا اپنے پاس نہیں رکھتے۔ اگرچہ اُسے نعیم سے الگ کرنے کی پوری کوشش کی گئی تھی اور نعیم خود اُس سے بے نیاز ہو چکا تھا مگر شباب کے پہلے احساس کے لئے وہ صرف نعیم ہی کی رہین منّت تھی۔ جبتک وہ نعیم کے قریب رہی اُسے اپنی گہری لگاوٹ ایک دلچسپ کھیل محسوس ہوتی رہی مگر جب نعیم سے بچھڑنے کا اٹل موقع اُس کی زندگی میں آیا تو رابعہ نے علانیہ محسوس کیا کہ یہ فقط نعیم سے اُس کی بالکلیہ علیحدگی نہیں بلکہ اپنے تمام وجود، خود اپنی چہیتی زندگی سے اُس کی قطعی علیحدگی اور دستبرداری ہے۔ اُس نے سب کچھ نادانستہ کیا۔ مگر سچائی اور خلوص کے ساتھ کیا۔ چنانچہ یہ بیاہ رابعہ کے لئے سخت ناپسندیدہ، ناخوشگوار، ناموزوں رہا۔ بیاہ کے بعد بھی رابعہ کے تصور اور طلب میں صرف نعیم ہی ایک مہک کی طرح رچا بسا رہا۔ اگر رابعہ کا دولہا، جذباتی، نظریاتی، عملی اعتبار سے نعیم سے کوئی قریبی مشابہت رکھتا تو شاید رابعہ کا پہلا تصور دوسرے نئے تصور سے ٹکرا کر بالکل ہی پاش پاش اور کھنڈر نہ ہو جاتا بلکہ سمجھوتے کی کچھ نہ کچھ سکت اندر صلاحیت ضرور خود میں پیدا کر لیتا۔ ایک نئے انسان سے بیاہ بھی کر لیتا مگر رابعہ کا دولہا اُس کے پہلے تمام تخیّل سے سرتاپا الگ ثابت ہوا۔ رابعہ کی فطرت، خواہش، ذہنی اُٹھان سے بالکل ہی مختلف، اُس کی تمنّا سے نہایت غیر ہم آہنگ لہذا رابعہ کا گڑبڑا جانا لازمی اور لامحالہ امر تھا۔ چنانچہ ایسے انسان کے روبرو ہونچکر وہ ایک دم بے جان اور بے آب ہوگئی۔ اپنی خواہش اور حقیقت کے اتنے زبردست تصادم اور تضاد کو برداشت نہ کر سکی اور خود کو زندگی بھر کے لئے مقید پا کر اُس کی زندگی کی تیزی سے پھلتی پھولتی سرسبز و شاداب ڈالی جیسے یکلخت ہی چٹ سے ٹوٹ گئی اور زندگی بھرتی ہوئی خوبصورت

خوش مزاج، کھلنڈری رابعہ زندگی کے اس اگلے ہی قدم پر بجھ کر کُھلا کر رہ گئی۔ اُس کی تمام طرّاری، تمنا، شوق، شوخی، چمک دمک، مسرت، اُس کا بھرپور شباب بہت جلد اُس کرم خوردہ کتاب جیسا پھیکا، مٹا اور نوچا ہوا نقشہ پیش کرنے لگا جس کا شوق سے پڑھنے والا کوئی نہ رہا ہو۔ اُس کا تمام کیف تمام راحتیں، روشن آنکھوں کے تمام رنگین خواب دفعتاً بدمزہ بے رنگ ہو گئے۔ خود رابعہ اپنے اندر رہ گئی۔ صرف ایک غلطی نے اس کا تمام راستہ گڈ مڈ اور پیچیدہ کر دیا۔ راستہ جو ابتدا میں ہی صحیح تعین اور توجہ چاہتا تھا۔ رابعہ اوٹ پٹانگ راہ کی راہی بن چکی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ اُسے کہاں پہنچنا، کیا کرنا ہے۔ اگر وہ جلد ہی اپنے ماں بننے کی حقیقت سے واقف نہ ہو جاتی تو شاید زندگی کا ہر سہارا پہلے ہی موڑ پر بالکل ختم ہو جاتا۔ وہ فقط گرا ہوا ملبہ ہو کر رہ جاتی۔ مگر ماں بننے کے احساس نے اُسے سنبھالا اور اُس کے تخیلات کے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں روشنی کی ایک ننھی سی مشعل تھما دی پھر گھپ، گھٹا ٹوپ اندھیرے میں صرف یہ مشعل ہی رابعہ کے تمام مستقبل کی ضیاء، ضمانت اور اُمید بن گئی۔ اس مشعل کو تھامے وہ زندگی کا کٹھن سفر کسی نہ کسی طرح طے کرنے لگی۔

اِدھر نعیم عائشہ سے تصادم کے بعد فوری جوش سے سنبھل کر، حالات کو از سرِ نو اپنے مطابق بنانے تھوڑی مہلت بھی لینا چاہتا تھا۔ خود حالات کو تھوڑی فرصت دینا چاہتا تھا۔ رابعہ کی غرقابی پر برہم یا ناخوش ہونے کی بجائے وہ خوش اور مطمئن تھا۔ رابعہ کی ناآسودہ ازدواجی زندگی کو رابعہ جیسی ہلکی پھلکی خود سپردہ لڑکی کے لئے ایک ضروری سزا متصوّر کر رہا تھا۔ بلکہ رابعہ کی رخصتی کے بعد اپنا راستہ اور بھی صاف محسوس کر رہا تھا۔

ان حالات میں جب انیسہ کے والد اچانک بیمار ہوئے تھے نعیم نے انیسہ کو مشورہ دیا کہ اُن کی تندرستی تک وہ پھر اپنے مائکے منتقل ہو جائے۔ اُن کی ضروری دیکھ بھال اور خاطر خواہ تیمار داری کرے۔

رابعہ کا خطرہ ٹل چکا تھا۔ اکیلی عائشہ پر نظر رکھنا بہت دشوار نہ تھا۔ لہٰذا اس تجویز کے دوسرے ہی دن انیسہ پھر اپنے ابا کے پاس منتقل ہو گئی اور اس بار میاں بیوی نے گھر کے ایک نسبتاً کشادہ اور بڑے حصّے پر اپنا قبضہ جما لیا۔ انیسہ کے آجانے سے انیسہ کے ابا بے حد مسرور ہوئے۔ اُن کی علالت اپنے دونوں نواسوں اور رینگتی ہوئی نواسی کی قربت میں کافی گھل گئی لیکن عائشہ سخت اُلجھن میں مبتلا ہو گئی۔ اب تو انیسہ بھی ڈرائونے خوابوں کے سلسلے میں اُس کی مدد سے صاف گریزاں اور قاصر معلوم ہوتی تھی۔ اور کھلا میدان زیادہ خطرناک ہو چکا تھا۔ ناکام حملہ آور زیادہ بے رحم دشمن معلوم ہو رہا تھا۔ پھوپا کی علالت کے موقع پر وہ صبح سے شام تک کمرہ بند کر کے بیٹھی بھی نہیں رہ سکتی تھی۔

یہ مناسب موقع تھا جب انیسہ نعیم کو فتح کر سکتی اور عائشہ کے ساتھ انصاف کر سکتی۔ مگر رابعہ والے واقعہ کے بعد وہ تو اپنی دانست میں عائشہ کو بھی بُرا مان چکی تھی۔ اور اُس کی یہ سوچ اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ اب اس میں ردّ و بدل کی مطلق گنجائش نہ رہی تھی۔ چنانچہ نعیم تو مگن اور مطمئن تھا مگر عائشہ قدم قدم پر مشکلات کا شکار، مشکوک اور بدظن ہو کر انیسہ اُس سے وجہ بے وجہ اُلجھنے لگی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر برہم ہو جاتی اور اُسے طعنے تشنے دیا کرتی۔ عائشہ کمروں، کونوں میں چھپ چھپ کر روتی۔ وہ کس سے مدد مانگے انیسہ کو کس طرح حال حقیقت سمجھائے۔ اُسے بس یہی ایک اُمید تھی کہ پھوپا ٹھیک ہو جائیں گے تو نعیم انیسہ پھر لوٹ جائیں گے۔ مگر قسمت تو جیسے عائشہ کا مزہ بتانے پر تُلی ہی گئی تھی۔ ایک رات پھوپا ہپٹاک سے مر گئے۔ عائشہ کو سکتہ ہو گیا۔

تدفین کے بعد نعیم نے انیسہ کے آنسو پونچھے اور اُسے سمجھایا، اب رونا دھونا ختم کرو، سب کو ایک دن مرنا ہی ہے۔ جائیداد سنبھالو کہ اب اگلے حالات ہی اہم ہیں اور انیسہ نے بادلِ ناخواستہ آنسو پونچھ لئے۔ تب تک نعیم اپنی پہلی ملازمت چھوڑ کر لکچرر ہو چکا تھا۔ اور خوب سر اُٹھا کر چلنے لگا تھا۔ حالانکہ عائشہ کو خوب یاد تھا کہ

جب وہ نیا نیا دولہا بنکر آیا تھا تو بات کرتے ہوئے بھی گھبرایا کرتا تھا۔ ایسا دبا دبا رہتا تھا جیسے پھنسا ہوا ہو اور اب تک بھی ابا کی موجودگی میں اُس کی آواز بہ مشکل سنائی دیتی تھی مگر اب ان کی موت کے بعد نعیم کا اکڑا ہوا سر دیکھ کر کوئی رابعہ کا کلیجہ چبانے لگتا۔ اور انیسہ کے اِترانے کا انداز بھی اب اور ہو گیا تھا۔ ہر محفل ہر موڑ پر وہ سب کو سُنا سُنا کے کہتی: "ہم اپنا کھاتے ہیں۔ نعیم کوئی بے روزگار تو نہیں۔ اس گھر میں رہتے ہوئے تو اب سینہ پھٹتا ہے مگر کیا کریں کوئی کاروبار کا دیکھنے والا بھی تو نہیں۔ پھر عائشہ کی ذمہ داری بھی تو ہے۔"

انیسہ کے آگے ایک مستقبل ضرور پھیلا ہوا تھا۔ مگر اب عائشہ کے سامنے کچھ نہ تھا۔ ابتدا سے وہ پُرمحبت، منظّم اور پابند زندگی کی عادی رہی تھی۔ مگر اب کسی تنظیم رُعب اور محبت کا نہ ہونا ہی اُسے حیران پریشان کیے دے رہا تھا۔ انیسہ بھی نرم و ملائم نہ رہی تھی لہٰذا عائشہ پھر ایک کمرے میں بند ہو گئی گھر کا سارا انتظام انیسہ نے سنبھال لیا۔

ابا کی موت پر رابعہ بھی آئی۔ مگر اس کا شوہر اور بچے اُسے چین ہی نہ لینے دیتے۔ ہمیشہ سائے کی طرح ساتھ رہتے۔ بچے نا سمجھ تھے مگر رابعہ کا شوہر تو بچوں سے بھی چھوٹا اور ہر وقت رابعہ پر مسلّط محسوس ہوتا تھا۔ یہاں نہ بیٹھو، وہاں نہ جاؤ۔ زور سے نہ بولو۔ سب کے درمیان نہ رہو۔ اس طرح رابعہ موجود رہتے ہوئے بھی غیر موجود تھی۔ اور انیسہ سب پر حاوی۔ جوں جوں اپنا تسلّط محسوس کرتی جا رہی تھی ایک نئے لُطف اور سرشاری سے گزر رہی تھی احساسِ فوقیت اور احساسِ برتری سے ہمکنار۔

تمام کام منشی، محرّر، مُلازم ہی نپٹایا کرتے تھے، مگر اُن پر اپنا کنٹرول قائم رکھنے کے لئے انیسہ کو جس برتاؤ اور نظر کی ضرورت تھی وہ انہیں ہوشیاری سے اپناتی جا رہی تھی۔ ان تمام خلافِ رجحان کاموں نے اُسے تھکایا نہیں بلکہ اُس میں مخصوص چاؤ کی

پیدا کر دی۔ وہ بہت جلد سمجھ گئی کہ وہ انسان جو خاموشی اور خلوص سے کام کریں اپنے تدبر اور کارکردگی کے باوجود اُتنے ممتاز اور مقبول، اُتنے نمایاں نہیں ہو سکتے جتنے، وہ انسان جو خواہ کام بالکل نہ کریں مگر کام کرنے کی ڈینگیں اور حوصلے ضرور ظاہر کرتے رہیں۔ جو کام کے آگے آگے، ساتھ ساتھ بھلے ہی نہ چلیں، پیچھے پیچھے ہی رہیں، مگر قدم اتنے نپے تلے انداز سے اُٹھائیں اور رکھیں کہ کام کا سب سے اہم اور مربوط حصہ معلوم ہوں۔

ایک بڑی جائیداد کے انتظام کے سلسلہ میں اُسے آئے دن مختلف لوگوں سے ملنا پڑتا اور جو لوگ حقیقتاً کام میں مصروف تھے اُنہیں تو انیسہ کو دیکھنے کی بھی فرصت و توفیق نہ ہوئی مگر وہ جو خواہ مخواہ کام سے چمٹے ہوتے تھے انیسہ کو دلچسپی اور خوش وقتی کا ایک دلکش اور زرّیں مشغلہ سمجھنے لگے۔ کہ مرد کو ایک عورت تو وہ چاہیے جو اُس کے گھر کی دیکھ بھال کرے، بچوں کی اچھی نگراں اور خود اپنی وفادار ہو۔ مگر اس سے ہٹ کر کھلاڑی مردوں کو ایک عورت وہ بھی چاہیئے جو خواہ کوئی ہو مگر اُس کے شوق اور ہوس کی پیاس وقتاً فوقتاً بجھاتی رہے اور مرد ایک کھلونے کی طرح اُس کے ساتھ کھیل سکے۔ ایسے سارے مردوں نے انیسہ کو دفعتاً بہت اونچائی پر پہنچا دیا۔ اُس کی تعریف و توصیف اور مداح سرائی میں کوئی کسر نہیں رکھ چھوڑی۔ اُس سے وابستگی میں اپنے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے لہٰذا ڈول ڈگمگا کر بھی اپنی ذات کے ربے ہوئے اصلی حصے سے چمٹی ہوئی انیسہ اس موقع پر ایک سسکی تک بھرے بغیر اپنے آخری حقیقی حصے کو چھوڑنے اور پرایا سمجھنے پر مصر ہو گئی۔ کیونکہ وہ دُنیا جو اُس کے اپنے وجود کی دُنیا تھی اُس کے روبرو وہ ہی نہ سکی تھی۔ اس طرح شادی چکی تھی کہ اب وہ اور دنیا کی دنیا کو ہی اہم اور ناگزیر سمجھ کر اُسی میں حصہ لینے اور خود کو کھونے پر مجبور ہو گئی۔ اُسے اپنی گم کردگی کا احساس تک نہ ہوا۔ تب ایک خیال! بہت پرانا خیال انیسہ کو کسی طرح مغلوب و مخلوط کرنے لگا۔ ذرا نعیم کو بھی بتا ہی دے کہ وہ کیا ہے۔ زندگی

کی بساط کا دراصل کتنا اہم اور کارآمد مہرہ۔ اور اگر اب تک نعیم اُسے سراہا نہیں سکا
ہے تو کم از کم اب سراہنے اور اُس کی حد سے زیادہ قدر کرنے پر مجبور ہو جائے۔ خود دیکھ
محسوس کر لے کہ اب ایک تو کیا کئی کئی نعیم اُس کے دیوانے مجنوں بنے ہوئے اُس کے
حرف ایک اشارے پر سر جھکانے اور دُنیا مٹانے کو تیار ہیں۔ چنانچہ بڑے فخر اور
ذہنی لذّت کے ساتھ انیسہ وہ آلۂ کار بن گئی جو استعمال کرنے والے کے ہاتھ بڑی
آسانی سے آجاتا اور سب کچھ کر گزرتا ہے۔ نعیم کی مدد کے بغیر بھی کامیاب اور بھرپور زندگی
گزار سکتی ہے۔ دراصل وہ شاہانہ مزاج ساتھ لے کر پیدا ہوئی ہے جو خود سب کی رہبری
کر سکتا، ہر پہلی صف میں موجود حکمرانی کر سکتا ہے۔

یہ خیال انیسہ کو اتنا بھایا اور پسند آیا کہ نعیم اُسے دفعتاً چالاک اور مغرور نظر
آنے لگا۔ اُس نے انیسہ کی ذہانت اور زیرکی کو اپنا تابع رکھنے کے لئے اُسے ہمیشہ احساسِ
کمتری کا شکار رکھا۔ شاید نعیم ڈرتا ہوگا۔ اُسے اپنی خصوصیات سے بیگانہ رکھ کر ہی اُس
پر حکومت کرنا چاہتا ہوگا۔ بیچارا نعیم!

غصّے کے ساتھ ساتھ انیسہ کو اُس پر ہنسی بھی آئی۔ رحم بھی آیا۔ ہا ہا ہا!

وہ بہت ہنسی بے حد ہنسی۔ وہ ضرور منفرد بنے گی۔ ساری دنیا پر چھا کر رہے گی۔ ایک
ایک مہان ہستی جو صرف ایک لکچرار کی حقیر اور پھٹیچر بیوی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہ تصفیہ کر
کے اُس نے خود کو خدمتِ خلق کے لئے پیش کر دیا اور اُس کے ماحول نے اپنا اثر بڑھانے
باقی رکھنے کے لئے اُسے حکومت کرنے کے مختلف گُر اور طریقے بھی سکھا دیے۔
جیسے اپنے مفادات کے لئے ہمیشہ چرب زبانی اختیار کرو۔ کسی کو خاطر میں نہ لاؤ۔ اپنی
غلطی کو کبھی غلطی نہ مانو بلکہ ہر بڑی غلطی کو نئی پوشاک پہنا کر سب کو اس پوشاک میں ہی اُلجھا دو
زیادہ عمل کی ضرورت نہیں مگر کام کا زبانی نقشہ کھینچئے اور تصویر پیش کرنے
میں ایسی مہارت کا مظاہرہ کرو کہ سننے والا مغلوب و مسحور ہو جائے۔

اتحاد کا اظہار ہر وقت پیشِ گفتگو رکھو۔ عوام کا دل دماغ موہ کر اُن کے پاس
صرف ان کے جسم چھوڑ دو۔ اُنہیں عقل استعمال کرنے کی مہلت یا موقع نہ دو۔ جب
بندوق چلانے کا موقع آئے تو اپنے بہی خواہوں اور حواریوں کو آگے کر دو۔ حکومت
کرنے کے لئے قابلیت کوئی ضروری نہیں صرف صلاحیت سازش ضروری ہے۔ ڈکٹیٹری
تو بڑی آسان آسامی ہے مگر.... انیسہ سارے طریقے ذہن نشین کرتی جا رہی تھی۔ لیکن
اِس بے تکے لفظ "مگر" پر گھبرا گئی۔ یہ "مگر" کیوں؟ اور سکھانے والوں نے جتایا
"مگر صرف وہی عورت یہ سب کچھ کر سکتی ہے جو کسی کے دباؤ میں نہ ہو بلکہ خود سب
پر حاوی اور قابض ہو۔ شوہر تک جس سے رام رہے ورنہ پھر کارنامے انجام دینا
مرد کے سر کرنا عورت کے بس کا روگ نہیں۔ دبّو اور ڈرپوک عورت کسی لائق نہیں۔"

اس آخری نکتے نے انیسہ پر دفعتاً کامیابی کے سارے راز روزِ روشن کی
طرح عیاں اور افشاء کر دیئے۔ یہی وقت ہے کہ وہ نعیم پر بھی اپنی دھاک جما دے۔
اگر یہ وقت نکل گیا، دولت اور اتنے بہی خواہوں کا سہارا ہاتھ سے چلا گیا تو پھر نعیم
کو زیر کرنا، اُس پہ قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ ساری زندگی اکارت، تمام مستقبل غارت
ہو جائے گا۔ بیوی بن جانا کون سا دشوار مرحلہ ہے۔ ہر عورت بیوی بن سکتی ہے۔ مگر
کوئی عمدہ کام کرنا کوئی معرکہ سرانجام دینا۔ سماجی مقام اور مرتبہ حاصل کرنا ہنسی، دل لگی
کھیل نہیں۔ ہر عورت کے بس کی چیز نہیں۔ اور انیسہ نے تہیّہ کر لیا اپنی شان کا سکّہ
سب پر چلا کر رہے گی۔ وہ کوئی معمولی عورت نہیں جو نعیم کے خیالات کے ساتھ گھسٹتی
پھرے، نعیم کی ہی تقلید کرے۔ اور اس نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی ہر اخبار میں اپنا نام جلی
سرخیوں سے لکھا دیکھا۔ ہر طرف اپنا پُرتپاک خیر مقدم ہوتے دیکھا۔ اپنی وہ بڑی بڑی
قدِ آدم تصویریں دیکھیں جو گلپوشش اور گلزار بنی ہوئی ہر اہم دیوار پر آویزاں۔ تاریخ
کے اَن گنے دھلے صفحات کا انتظار کر رہی تھیں۔ اور اس تصور کے ساتھ ہی اُس میں

ایک ایسا عزم جاگا جو پہاڑوں سے بھی ٹکرانے کی ہمت رکھتا تھا۔ نعیم تو محض انسان تھا، گوشت و پوست کا بنا ہوا انسان۔

اُس رات کا کھانا مدعوں کی پوری جماعت کے ساتھ نہایت شاندار طریقے سے کھایا گیا۔ اور چلتے چلتے کسی بے حد عقلمند مخلص نے انیسہ کو ضروری طور پر یہ بھی بتا دیا کہ صرف گھڑ سوار ہی انجانے کھڈ اور گڑھے بے جانے بوجھے پھلانگ سکتے ہیں کہ جانوروں میں خطرے یا دشواری کا قبل از موقع ادراک اور جست کی فطری جبلت اور صلاحیت ہوتی ہے جبکہ پیدل انسان گہرے کھڈ یا گڑھے عبور نہیں کر سکتا اور دوسرا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تب انیسہ نے اپنی سب سے میٹھی نگاہ اس پر پھینکی۔ وہ واقعی کتنی شکور و ممنون تھی کہ اپنے صحیح حال، حقیقت اور طاقت سے آگاہ کی گئی۔ ورنہ عمر بھر ایک بند چار دیواری میں محبوس سڑ گل جاتی اور کوئی اس کا نام و نشان بھی نہ جان پہچان پاتا۔ اس کے بعد نعیم کی بھی اُسے زیادہ فکر نہ رہ گئی۔ اس آخری بچے کو جو پھر انیسہ کے پیٹ میں پلنے لگا تھا۔ زندگی کا قالب عطا کرتے ہی وہ فوراً پبلک پلیٹ فارم پر نمودار ہو جائے گی کہ بچے پیدا کرنا تو بڑا سہل عمومی مسئلہ ہے۔ بکری بھینس بلی تک بچے پیدا کر سکتی ہے مگر زمانے کے اسٹیج پر ایک خاص رُخ حاصل کرنا کتنا اشد اور اہم جو بچوں کی پیدائش سے بھی اگو یہ معاملہ ہے۔ زیادہ امتیاز اور مقبولیت عطا کرنے والا۔

انیسہ پھولوں نہ سمانے لگی۔ ابا نے ناحق اتنے دنوں تک جینے کی زحمت برداشت کی۔ اگر وہ بھی امی کے ساتھ ہی گزر جاتے تو نہ جانے وہ اب تک اپنی شہرت اور مقبولیت کی کتنی منزلیں طے کر چکی۔ اوج اور عروج کے کس بام تک نہ پہنچ گئی ہوتی مگر خیر پرواہ نہیں وقت اور موقع اب بھی اُس کے ہاتھ میں ہے۔ عائشہ کا کہیں ٹھور ٹھکانہ کر دے تو اطمینان سے اپنے لئے جیئے۔ پھر اُسے کسی فکر کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

ویسے اب گھر آنے جانے والوں کی کمی بھی نہ تھی اچھا خاصہ ہجوم، ہر قماش کا

ہروقت آیا جایا کرتا تھا لیکن ہاتھوں ہاتھ اُٹھا کر عائشہ کو کسی کے سر مُنڈھ دینا ممکن بھی تو نہ تھا۔ اس خیال کے تحت انیسہ کو عائشہ کی گوشہ نشینی کھلنے گی۔

"اندھیرے کونے میں پڑے پڑے اپنی صحت تباہ کر کے بدنام کرو مجھے۔ میں تمہیں کھانے کو تھوڑی دیتی ہوں۔ ہنسنے بولنے تھوڑی دیتی ہوں۔ میں نے تو تمہیں قید کر دیا ہے نا؟" وہ ایک منصوبے کے تحت عائشہ سے بولی۔

"یہ بات نہیں مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا باجی۔"

"چلو اب ختم کرو یہ نخرے۔ ہر چیز حد میں بھلی لگتی ہے۔ باہر نکلو۔ قرینے سے رہو، انسانوں کی شکل بناؤ۔ زندگی میں حصّہ لو۔ کوئی تو تمہیں بیاہ کے لے جائے آخر کب تک میری جان پر بیٹھی رہو گی۔"

اچھا تو یہ مہربانی اس لئے ہو رہی ہے عائشہ نے سوچا۔ یہ عنایت اسی لئے کہ اُسے نمائش میں رکھ کر جلد از جلد ٹھکانے لگا دیا جائے مگر عائشہ مرد سے اتنی خائف تھی کہ اُسے بیاہ کے خیال ہی سے وحشت ہونے لگی۔ وہ اپنی گوشہ نشینی ترک کر کے فوراً گھر کے کام کاج میں مصروف ہوگئی۔ شاید اس کا بیٹھے بیٹھے کھانا باجی کو گوارا نہیں اب وہ خوب کام کرے گی۔ اتنی محنت، اتنا کام کہ باجی بغیر اُس کے سہارے کے رہ نہ سکیں۔ اس کے بغیر کبھی اپنا کام نہ چلا سکیں۔ کبھی اس کا بیاہ نہ کرسکیں۔ اور اس ارادے کے بعد وہ بند کمرے سے نکل کر گھر میں ہر وقت قلانچیں بھرنے لگی۔ ہر کام میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی دکھانے لگی۔ یوں تھوڑی تازگی، تھوڑا اجالا اُس کے بے آب چہرے پر پھر کروٹیں بدلنے لگا، اُسے پھر نکھارنے لگا۔ بند کمروں کے حبس اور تنہائی کی جگہ اب تازہ ہوا کے ہلکورے اور روشنی کے تھپیڑے اُسے اُبھارنے، اُجاگر کرنے لگے۔ وہ دوڑ دوڑ کر پوری پھرتی اور انہماک سے ہر کام سمیٹنے نپٹانے لگی۔ مگر انیسہ کو یہ بھی پسند نہ آیا۔

"دیکھو! دیکھو!!" اُس نے نعیم سے کہا: "کتنی بے حیا ہے تم سچ کہتے تھے، نعیم کہ عائشہ بڑی پوشیدہ لڑکی ہے۔ یا تو سدا مُنھ لپیٹے کمرے میں پڑی رہتی تھی۔ یا جب سے اپنے بیاہ کا ذکر سُن لیا ہے۔ تازہ دم ہرنوں کی طرح کُلیلیں بھرنے لگی ہے۔ پرندوں کی طرح چہچہا رہی ہے۔ یہی غم تھا نہ ابّا کا، یہی سوگ؟" "چھوڑو بھئی بچّی ہی تو ہے اور بیاہ کے ذکر سے خوش ہونا کوئی بُری بات بھی تو نہیں سبھی ہوتے ہیں۔ کیا تم خود اپنے بیاہ سے خوش نہیں تھیں؟" نعیم دکھاوے کی مکّاری کرتا۔

"چلو میرا ذکر چھوڑو، بات سے بات نہ نکالو۔" "اور بات سے بات نکال کر ہی میں تمہیں یہ جتانا چاہتا ہوں کہ غیر اہم باتوں کے لئے اس کی جان نہ کھایا کرو۔ اس طرح کُڑ کُڑ کر چلّا چلّا کر تم خود بدمزہ، بدنام ہو جاتی ہو۔ کسی کا کیا بگڑتا ہے۔"

انیسہ نے سوچا واقعی یہ تو ٹھیک ہے۔ اور چُپ ہو گئی۔

نعیم اپنے خفیہ فرائض پھر انجام دینے لگا تھا۔ اور اپنی عمدہ کارگزدگی سے یہ یقین دلانے پر مُصر تھا کہ وہ ایک سچّا اور اچھا انسان ہے۔ مگر جس سے سمجھوتا کرنا سیکھ کر وہ غیر محسوس طور پر اپنی ذات اور ذہن کا اتحاد اور استحکام بھی کھو چکا تھا۔ اپنا ارادہ اور استقلال متاثر کر چکا تھا۔ آسائشوں کے قریب پہنچ کر امارت کے نشے سے مانوس و مخمور ہونے لگا تھا۔ امارت کی اہمیت و افادیت کا رفتہ رفتہ قائل، فراغت، عیش و عشرت اور طرب کا دیوانہ، سختیوں، دشواریوں اور آزمائشوں سے غیر شعوری طور پر منکر و نامانوس ہوتا ہوا اپنے اس تجربہ کو محض جنس اور جمالیات کے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا اور اپنے نرالے ذوق کی نمود کے ناطے پرورش کرتا ہوا جو یہ سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا کہ کسی بھی کسی عنوان تلے ذات کی تقسیم ذات کا زوال ہے اور ایک مقرر، منفرد شکل ہی کسی کی جان پہچان۔

وہ شخصی طور پر دولت کے قریب نہیں گیا تھا۔ مگر فراہم کردہ آسانیوں سے اکتساب

غرور کر رہا تھا۔ اور یوں بے دھڑک اُس راہ پر چل نکلا تھا جو بڑی عارضی اور پُرخطر راہ تھی۔ اُس پگڈنڈی کی طرح جو مخصوص متعین راستہ سے ہٹ کر محض چند عجلت پسند بے صبر سواریوں کے گزرنے اور نسبتاً چھوٹا راستہ تلاش کرنے کی ایک بے سُود کوشش اور جدوجہد تھی۔ کم محنت کم مسافت اور کم سے کم وقت میں منزل پر پہنچ جانے کی خواہش کی بنائی ہوئی ایک کچی پگڈنڈی جو پکّی سڑک سے ہٹ جانے اپنی زد پر آجانے اور خود پر سے گزرنے کے بعد ہی گزرنے والے کو اُن جھٹکوں، دھچکوں، ہچکولوں اور ناہمواریوں کا احساس و اندازہ دِلا سکتی تھی جو صاف سپاٹ پختہ اور معیّن سڑک پر گزرتے ہوئے کبھی محسوس نہیں ہوسکیں۔ دشواریوں اور ناہمواریوں کا نعیم کو بھی کافی تجربہ ہو رہا تھا۔ مگر بنا بنایا مخصوص راستہ خود چھوڑ کر ہٹ جانے اور اپنے تلاش کئے ہوئے راستہ پر چل پڑنے کے بعد اب وہ لوٹ کر خود سے شرمندہ ہونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا دنیا تو، دوسروں کی شرمندگی کو جلد یا بہ دیر بھول جاتی ہے۔ مگر اپنا دل دماغ کبھی ایسی شرمندگی کو نہیں بھولتا۔ جو خود اپنے ہاتھوں اپنے حصّے میں آئے۔ اور نعیم صرف شرمندگی کو ہی اپنا حصّہ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ بلکہ خود کو کسی بھی غلطی کے لئے مرتکب نہ ٹھہرا کر سب کچھ پالینا چاہتا تھا۔ دولت کی قوّت پاکر انیسہ کے بدلتے ہوئے رنگ ڈھنگ بھی وہ دیکھ رہا تھا۔ مگر انیسہ کو بہادروں کی طرح شیوۂ مردانگی کے مطابق ننگی تلوار سے نہیں مارنا چاہتا تھا۔ بلکہ ایسے زہر سے جو اپنا کام بھی کر جائے اور مجرم کا کھوج بھی نہ کر پائے۔ اب وہ چاہتا تھا کہ دنیا سے خوب کھیل اور ٹکرانے کے بعد انیسہ خود جان جائے کہ دنیا کیا ہے۔ تب لازماً اُسے نعیم کی ضرورت ہوگی۔ اور اُس وقت نعیم اُس کا آخری اور واحد سہارا ہوگا۔ تب تک انیسہ کے گھر رہنے سے نعیم کو بھی اتنا وقت اور موقع مل ہی جائے گا کہ وہ اپنی خواہشات سے نپٹ لے۔ جی بھر سیراب ہولے۔ ایک دوسرے سے دوری اور بربادی میں دونوں کے نقصانات اور فائدے تھے۔ اس وقت

دونوں خواہشات کے غلام تھے جنھیں ایک دوسرے سے بڑھکر دنیا کی ضرورت تھی۔
اور دنیا کے بغیر جو اپنی تسکین نہ کر سکتے تھے نعیم یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ بظاہر عائشہ
جیسی بھی نظر آئے مگر اندرونی طور پر بالکل ٹوٹ چکی ہے۔ اور یہی وہ عین موقع ہے
جب انیس کو اس کے راستہ پر چھوڑ کر وہ ٹوٹی ہوئی عائشہ کو دوبارہ جوڑنے کے بہانے
بالکلیہ توڑ مروڑ سکتا ہے۔ چنانچہ ایک روز پھر ہمت کر کے اس نے عائشہ سے کہا:

"ذرا آئینے میں خود کو دیکھو عائشہ، تم کتنی زرد، کتنی کمزور، ہو چکی ہو۔ تم کس
قدر اکیلی ہوتی ہو۔ انیس کی زیادتیوں کا شکار۔ تمہیں بچانے، محفوظ رکھنے، تمہاری طرفداری
کرنے والا کوئی نہیں۔ خود کو اس طرح گنوا دینا کونسی عقلمندی ہے بھلا۔ پھر ایک بار میری بابت
سوچو۔ میں اتنا بُرا نہیں جتنا تم مجھے سمجھ بیٹھی ہو۔"

"اوہ! پلیز یہ گفتگو" عائشہ تڑپی اور اُس نے منھ پھیر لیا۔ "مجھے اب
زندگی کو خوشی اور تفصیل سے دیکھنے، اچھا بُرا محسوس کرنے، مزید پانے کی خواہش بھی نہیں
رہ گئی ہے۔ جیسی بھی گزرے بس گزر جائے۔ جلد جلد ختم ہو جائے۔"

"میں جانتا ہوں سخت اور ناپسندیدہ حالات نے تمہیں مایوس اور مریض بنا
دیا ہے۔ مگر تم کتنی غیر معمولی لڑکی ہو کم از کم اسے تو محسوس کر لو۔"

"وہ عائشہ مر چکی ہے نعیم بھائی۔ کب کی مر چکی۔"

"یہی مت سوچو، یہی مت کہو۔ یہی تو میں سننا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں بچانا
چاہتا ہوں۔ بہر حال میں بچانا۔"

"شکریہ مجھے کسی منزل کی تلاش نہیں۔"

نہیں مانے گی کمبخت، نہیں مانے گی نعیم نے سوچا مگر اپنی اُبال کی کیفیت
کو ضبط کر کے چالاکی سے بولا: "یہ نہ سمجھو میں صرف تمہارا جسم چاہتا ہوں۔ مجھے تمہارے
احساس تمہارے اندازکے سبھی زاویوں سے دلچسپی ہے عائشہ۔ تم سب سے بہت مختلف ہو۔

قیمتی خزانے کی طرح :

"خدا کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دیجئے، میرا مذاق نہ اڑائیے۔" عائشہ نے اپنا چہرہ ڈھک لیا اور آہستہ آہستہ سسکنے لگی پھر جب نعیم چلا گیا تو اُس نے سوچا، کیا مجھے نعیم بھائی کی بات مان ہی لینا چاہیئے ؟ کیا اس کے سوا میری نجات نہیں ؟ مگر کلفت اُسے پھر بری سی لگی وہ یہ تہیہ کرنے پر مجبور ہو گئی کہ اُسے قید قبول ہے۔ موت قبول ہے مگر دھوکے کا ساتھ قبول نہیں۔ یہی سوچ سوچ کر جب وہ اپنے الم کو بہلا رہی تھی تو اچانک ایک واقعہ پیش آیا۔ اگلے ہی دن انیسہ اور نعیم کی غیر موجودگی میں ملازم نے آکر بتایا کہ کوئی صاحب اشد ضروری کام کے سلسلہ میں آئے ہیں۔

"کہدو باجی گھر پر نہیں۔" عائشہ نے روکھائی سے کہا۔

"مگر وہ کوئی ضروری بات بتانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے آپ گھر پر موجود ہیں۔" بادلِ نخواستہ عائشہ ملاقاتی کمرے میں پہنچی اور رسمی سلام علیک کے بعد بولی "فرمائیے"

"یہ بہت اہم کاغذات ہیں۔ مسز نعیم تک پہنچانے ہیں۔ کیا میں انہیں آپ کے حوالے کر سکتا ہوں ؟" — عائشہ نے ہاتھ بڑھا کر کاغذات لے لئے۔ لڑکا واپس چلا گیا۔

دوسرے دن اتفاق سے پھر وہ ایسے وقت آیا جب اکیلی عائشہ ہی گھر پر تھی۔ عائشہ چڑ گئی، "آپ اُن سے وقت لے کر کیوں نہیں آتے ؟" "بگڑئیے مت، آیندہ سے یہی کروں گا۔ آپ کو زحمت نہیں دوں گا۔ لڑکے نے کچھ اس طرح کہا کہ عائشہ اپنی بداخلاقی پر شرمندہ ہو گئی۔

"زحمت کی بات نہیں آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ وہ گھر پر کم ہوتی ہیں۔ ویسے میں نے آپ کے کاغذات اُنہیں پہنچا دیتے ہیں۔" "بہت، بہت شکریہ۔ میں بس اتنا ہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اب خود مل کر اگلی بات کر لوں گا۔" وہ جانے کے لئے پلٹا۔ تب اپنی بداخلاقی کی کوفت مٹانے کو عائشہ بولی : "میرے لائق کوئی اور خدمت ؟ چائے وغیرہ ؟"

"جی نہیں شکریہ، آپ کے غصّہ سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

عائشہ یکایک ہنس پڑی۔ اُسے لڑکے کی بے ساختگی اچھی لگی۔ "میں اتنی غصیلی نہیں لیکن.... اُس کی سمجھ میں نہ آیا آگے کیا کہے لہٰذا جلدی سے بولی، "چائے تو پی لیجئے۔"

"چائے پینے میں کوئی حرج نہیں۔" اور یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ اگر انکار کروں گا تو پھر آپ کا ٹمپریچر نہ جانے کہاں پہنچ جائے گا؟" عائشہ نے سرسری نظر سے دیکھا۔ لڑکا زیادہ عمر کا نہ تھا، پھر بھی معقول تھا۔ اُس کا چہرہ خوبصورت نہیں تھا، مگر اُس کی آنکھوں میں وہ حرص و ہوس بھی نہیں تھی جو لڑکیوں کے مقابل زیادہ تر مردوں کی نظروں میں فوراً پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ چائے لانے اندر چلی گئی اور کچھ دیر بعد جب چائے لے کر آئی تو لڑکے نے چائے پیتے ہوئے پوچھا: "آپ کی تعریف؟"

"میں مسز نعیم کی کزن ہوں۔"

"اور نہیں رہتی ہیں ---؟"

"ہاں خوش قسمتی یا بد قسمتی سے۔"

"آپ کا اپنا گھر۔ والدین ---؟"

"میرا گھر یہی ہے۔ میرے والدین نہیں۔"

"اوہ ---!" لڑکے نے تاسف سے کہا اور چند منٹ کے لئے بالکل خاموشی چھا گئی۔

"مسز نعیم اتنی قابل ہیں یقیناً آپ بھی کچھ کم قابل نہ ہونگی مجھے آپ سے ملنے کا اتفاقاً شرف حاصل ہوا۔ اس کی بے حد خوشی ہے۔" عائشہ ہاتھ میں تھمے پیالے کو گھورتی رہی۔ چائے ختم ہو گئی۔ لڑکا واپس چلا گیا مگر اُس رات مارے خوشی کے عائشہ سو نہ سکی۔ یہ خوشی خود اُس کی فہم سے باہر تھی مگر وہ خوش تھی۔ لڑکے کے مخلصانہ رویّے اور اُس کے صاف ستھرے لہجے اور گفتگو پر کئی دنوں بعد کسی چیز نے اُس کے دل کو چھو لیا تھا۔ کوئی ایسی چیز جو اُسے جھوٹی نہ محسوس ہو رہی تھی۔ تصنّع اور دھوکا نہ محسوس ہو رہی تھی۔ انبساط سے اُس کا وجود

بقعۂ نور بن گیا۔ مدبروں کی طرح اُس نے اِس خوشی کو ہر طرح جانچا پھر سارے گھر میں کلیلیں بھرتی پھری۔ کوئی نرم نرم شیریں شیریں سا احساس شربت کے گھونٹ اور مکھن، بالائی کے ملائم پیڑے کی طرح اُس کی ذات کے ذایقے سے گزرنے لگا۔

کافی دن اس خوشی کے سہارے گزر گئے۔ اپنی دانست میں وہ لڑکے کا انتظار نہیں کر رہی تھی مگر اکثر شاموں میں بار بار جا کر ملاقاتی کمرے میں جھانکنے لگتی۔ جب بہت دنوں تک وہ لڑکا نہیں آیا تو عائشہ رنجیدہ ہونے لگی۔ دنیا سے بیزار اُس کا اُکتایا ہوا دل اس خواہش سے معمور ہونے لگا کہ وہ آہی جائے۔ سچی خوشی کے چند لمحے پھر اُسے دے جائے اور ٹھیک اُس وقت جب وہ مایوس ہونے لگی تھی ایک شام دفعتاً وہ آگیا اور عائشہ سے مڈبھیڑ ہوتے ہی بولا: "میں آیا نہیں بُلایا گیا ہوں"

عائشہ نے گھور کر اُسے دیکھا۔ "کس نے بلایا ہے؟" وہ اُس کے ذو معنی جملے پر پوچھ بیٹھی۔

"مسز نعیم نے" لڑکا جھٹ بولا۔

عائشہ ذرا سا مایوس ہوئی مگر اپنی مایوسی چھپا کر بولی: "اور بُلا بھی کون سکتا ہے"

"کیوں؟ اگر آپ بھی حکم دیں تو میں برابر حاضر ہو جایا کروں گا۔"

"مجھے حکم دینا نہیں آتا"

"ارے" لڑکا ذرا سٹپٹایا پھر بولا: "تو بس کہدیا کیجئے کسی بھی طرح"

"مگر مجھ سے تو آپ کو کوئی کام نہیں"

"کیا کام کے بغیر ملاقات منع ہوتی ہے۔؟"

ٹھیک اسی وقت باہر موٹر کا ہارن بجا اور عائشہ گفتگو بھول کر جھٹ اندر بھاگی۔ لڑکا بھی مسکرانا، خوش ہونا بھول کر سنبھل گیا۔ انیسہ ملاقاتی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ "اوہو! آپ" لڑکے نے خوش دلی سے سلام کیا اور بیٹھ کر معاملے کی

بات کرنے لگا۔ عائشہ کو پتہ بھی نہ چلا کب گفتگو ختم ہوئی کب وہ لوٹ گیا۔ مگر وہ اُسے ایک مستقل احساس ضرور عطا کر گیا تھا۔ دلچسپی اور انہماک کا عجیب انوکھا سا احساس۔ وہ اُسے قطعی جانتی پہچانتی نہ تھی مگر ہمہ وقت اب اُسی کے خیال میں گُم رہنے لگی۔ مدتوں بعد ذرا میٹھی زندگی گزارنے لگی۔ اب اُس کے سینے میں دل کی جگہ کوئی طوفان میں اسٹارٹ رہتی تھی جو چھکا چھک بھاگتی ہی رہتی اور عائشہ سے اپنا وجود سنبھالے نہ سنبھلتا۔ اب نہ انیسہ کی ڈانٹ پھٹکار اُسے رنجیدہ کرتی نہ نعیم کی بھوکی نظریں حیران پریشان کرتیں۔ اُس کا جی چاہتا اپنے ہی خیالوں میں مگن کہکشاں کا راستہ طے کرتی جائے، روشنیوں کا دامن تھامے رہے اور پھر اگلی بار جب وہی لڑکا آیا تو بولا: "میں آج خود آیا ہوں، صرف آپ سے ملنے" مشتاق عائشہ دھڑک کر رہ گئی۔

"مجھے اتنی اہمیت نہ دیجئے"

"حالانکہ میں تصفیہ کر چکا ہوں۔ آپ سے یہی پوچھنے آیا ہوں کہ کیا میں مسز نعیم سے آپ کو مانگ لوں۔ آپ مجھے اچھی لگنے لگی ہیں"!

عائشہ بوکھلا گئی۔ وہ کیا کہے۔ اُس کا اپنا دل شاید یہی چاہتا ہے مگر وہ کس طرح ہاں کہہ دے۔ اور اُسے تذبذب میں دیکھ کر لڑکا بولا:

"زبردستی نہیں مگر خدا کے لئے انکار نہ کیجئے۔ مجھ پر اعتماد کیجئے"

عائشہ نے نگاہ اٹھا کر اُسے دیکھا اور اُس کی نرم نگاہی کی شہ پا کر لڑکا دفعتاً آگے بڑھا۔ "میں آپ کی بے نیازی کا اسیر ہو چکا ہوں۔ آپ کو وسیع آسمان کی طرح محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے ناامید نہ کر دیجئے گا" اُس نے آہستگی سے عائشہ کو تھام لیا اور دھیرے سے اُسے چوم لیا۔ عائشہ کو نہ غصہ آیا۔ نہ نفرت ہوئی۔ نہ لڑکے کے ہونٹ اُسے کیلے یا چبھتے ہوئے محسوس ہوئے بلکہ ان ہونٹوں کا لمس اُس میں حلاوت کی طرح پھیل گیا نغمے کی طرح گونجنے لگا۔ روشنی کی طرح چمکنے، اُبھرنے لگا۔ اس نے آہستہ سے خود کو چھڑایا اور

بولی: "میں اِتنی اچھی نہیں پھر بھی آپ کی مرضی!" اور اتنا کہہ کر وہ فوراً اندر بھاگ گئی۔ ایک طرح کی زمی ایک طرح کا نشہ ایک قسم کی لذّت اور طمانیت اُسے مخمور، مسحور کرنے لگی۔ کسی نے دفعتاً اُسے اُٹھا کر مخملیں سیج پر پہنچا دیا اور نہ جانے کتنے چاند سورج، ستارے اُس کے مستقبل کے آسمان پر دمک اُٹھے۔ شفق اُس کے ارد گرد پھول گئی۔ پھول چھومنے اپنا عطر اُس پر چھڑکنے لگے۔ گیت اُس کے ہونٹوں پر مچل گئے۔ خوبصورت سنہرے خواب آناً فاناً اُس کی کھلی آنکھوں میں چمک گئے۔

کاش ایسا ہو جائے! ہو ہی جائے!!

وہ مدہوش سی بستر پر جا پڑی۔ اور نیند میں بھی اُس کے تمام خد و خال۔ اُس کا سارا جسم آتش بازی کے اناروں، پھلجھڑیوں اور مہتابیوں کی طرح لو دینے لگا۔ جیسے تمام روشنیاں منجمد ہو کر عائشہ کا سراپا بن گئی ہوں اور ساری شرابیں، خوشبوئیں آ آ کر عائشہ میں گھُل مل گئی ہوں۔

اگلے دن اُس لڑکے نے انیسہ سے بات کی۔ انیسہ فوراً تیار ہو گئی۔ وہ تو دِل سے چاہتی تھی کہ کسی طرح عائشہ دفع ہو۔ چنانچہ اُس نے یہ بھی نہیں جاننا چاہا کہ لڑکا عائشہ کے بارے میں کیا جانتا ہے؟ کس طرح جانتا ہے؟ کب سے جانتا ہے؟ اُسے عائشہ پر غصّہ ضرور آیا کہ اُس نے اِس معاملہ کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ مگر یہ غصہ ظاہر کرنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ بات کو طول دیئے بغیر یہ مرحلہ جلد سے جلد نپٹا دینا چاہتی تھی لہٰذا اُس رات سونے سے پہلے نعیم سے بولی: "لو خدا خدا کر کے عائشہ کا ٹھکانہ طے ہو گیا!"

"کیا مطلب؟" نعیم نے چونک کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ عائشہ کا رشتہ طے ہو گیا ہے اور میں جلد سے جلد اُس فرض سے سبکدوشی چاہتی ہوں۔ لڑکا مناسب ہے لہٰذا میں نے زبان دے دی ہے۔"

"تمہیں تو ہر بات کی عجلت رہتی ہے انیسہ۔ اتنے اہم معاملہ میں کوئی پوچھ تاچھ کوئی دریافت ضروری ہے کہ نہیں۔ کل کو اگر بات نہیں بنی تو دنیا ہمیں ہی نام دھرے گی۔ عائشہ کی زندگی الگ ضیق میں رہے گی۔"

"تم پریشان مت ہو، ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ لڑکا اچھے خاندان کا ہے۔ کماتا بھی ہے۔ خود جلد سے جلد بیاہ کرنا چاہتا ہے۔ پھر ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھلا؟" انیسہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور اُٹھ گئی۔

نعیم تاؤ پیچ کھاتا رہ گیا۔ اُس کے چہرے پر ایک خوفناک لیک پیدا ہوئی۔ جیسے کوئی ڈراؤنا مہیب خواب اُس کی پلکوں تلے رُکا رہ گیا ہو۔ کوئی خوفناک خیال جونک کی طرح اُس کی کامرانی سے لپٹ گیا ہو۔ جیسے کوئی تیز آرا اُس کی دیرینہ خواہش کا گلا چیرتا ہوا آر پار ہو گیا ہو۔ وہ انیسہ سے کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا۔ انیسہ کو کسی طرح روکنا چاہتا تھا مگر انیسہ نے جس انداز میں بات ختم کی تھی وہ اُس کے لئے بڑا ہتک آمیز تھا۔ انیسہ نے اُسے یہ تک نہیں بتایا تھا کہ کون لڑکا ہے؛ کس خاندان کا ہے؛ کرتا کیا ہے؛ وہ دیر تک انیسہ کے لئے نفرت محسوس کرتا رہا۔ کاش انیسہ مرجائے! فوراً مرجائے! مگر انیسہ کی موت کی بجائے عائشہ کی بارات دروازے پر آکھڑی ہوئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے نعیم کے تمام ارادوں پر خاک ڈال، دلہن بن عائشہ اپنی سسرال سدھار گئی۔ نعیم کے سارے منصوبے، ساری کوششیں قلعی اُترے تانبے کی طرح ملگجی، بے آب رہ گئی۔

ناکامی، مایوسی اور عائشہ کے بیاہ نے نعیم کو ایسا خالی ڈھنڈار کر دیا کہ اُسمیں سوائے بھائیں بھائیں کرتی خاموشی کے کچھ اور باقی نہ رہا۔ اب وہ کیا کرے؟ — کیا؟ مگر کچھ نہ کچھ کرنا بھی ضروری تھا کہ "ذات ہوتی نعیم دو حصّوں، دو خانوں میں بٹ چکا تھا۔ وہ نظریات کے لحاظ سے ایک سوشلسٹ تھا مگر جنسی بحران اور ہیجان کا شکار ہو کر

سمجھوتوں کا عادی بھی ہو چکا تھا۔ اب اُسے گھر اور انیسہ سے مطلق کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ وہ ایسی پناہ گاہ چاہتا تھا جہاں انیسہ نہ ہو۔ انیسہ کی پرچھائیں تک نہ ہو۔ وہ خود ہو اور اُس کی طلب، اُس کی خواہش، اُس کے ارمان۔ چنانچہ تب اُس کی نظر گھر کی سونی چار دیواری سے نکل کر لامحالہ کالج پر پڑی۔ کالج جہاں کئی لڑکیاں اُس کی طالبات تھیں اور عائشہ کے چکر میں جن پر اُس نے اب تک توجہ نہ کی تھی مگر اب اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

ثروت اُس کی سب سے اچھی طالبہ تھی اور خوب صورت بھی لہٰذا نعیم کا پہلا قدم اُسی کی طرف بڑھا۔ دونوں عجلت سے قریب ہونے لگے حتّٰی کہ ایک حد اور نوبت ایسی بھی آ پہنچی جب خود سپردگی اور خود حوالگی کے لئے بہ دل و جاں تیار ثروت نعیم کی آغوشِ تمنّا میں سمانے، خود اپنے چاہ و ارماں کی بھوک مٹانے ہر ہر طرح آمادہ و تیار ہو گئی۔ وہ کئی بار نعیم کے گھر آ چکی تھی۔ مگر اُس رات جب مہتابی خد و خال والی یہ زیبا لڑکی اپنے دلدار بانکپن اور طرحدار رویّے کی تمام خوش خیالی اور خوش آیندگی کے ساتھ نعیم کی خواب گاہ میں پہنچی تو کوئی اُس کی آمد سے واقف نہ تھا لہٰذا دبیز شریں کے مسرتوں کے فوارے آن کی آن میں اُچھلنے، لپکنے لگے اور شراب کے تند نشے، انبساط و طرب اور وفورِ شوق کے آئینہ خانے میں محبوس ثروت کو خود بھی احساس نہ ہوا کہ زندگی کے رُخِ زیبا کا شوخ، کنوارا، گلگوں غازہ اُس کے جسم اور چہرے سے نوچا، کھرچا جا چکا ہے اور اب اُس کے بانکے ریشمی جسم پہ فقط معصیت کے وہ کالے مہاسے اور نشان ہی باقی رہ گئے ہیں، جو سدا کے لئے داغ دھبّے بن کر اُس کے وجود سے چمٹ گئے ہیں اور وہ ہنسی جو نعیم کے لئے ٹھیک اُس کے دل سے کھنچ کر اُس کے ہونٹوں پر آئی ہے بالکل کھوکھلی۔ سدا کے لئے تیرہ و تار، بے آواز، بے جھنکار، بے نام و نمود ہو چکی ہے کہ نعیم کی جوانی بستی درحقیقت اُس لطف و کرم،

عنایت والتفات اور سچی وابستگی سے قطعی محروم ہے جس کا اقرار و اقبال ہر لڑکی کی زندگی میں ایک نئے اور دلکش باب کا اضافہ کرتا ہے۔ جس باب میں درج ہر لفظ سچا اور اہم ہوتا ہے بلکہ اس ہنسی کی اہمیت اتنی ہی ہے کہ نعیم اس کے توسط سے جی بھر کر دوشیزہ کے بدن کی سیر کر لے۔ سیر جس کی خواہش نعیم کے تمام حواسوں پر بھوت، پریت، کی طرح مستقل مسلّط ہو گئی تھی اور جسے تمنّا کا خوب صورت عنوان دے کر نعیم نے یہ سارا کھیل کھیلا، ناٹک بنایا تھا۔ نہ نعیم کے دل میں ثروت کی محبت تھی نہ اُس کی نسوانیت کے لئے کوئی پُر تپاک، باوقار جذبہ واحترام نعیم کے لئے ثروت اُس شراب کی طرح تھی جسے وہ ہر رات طلب سے مجبور استعمال کرتا اور رات بھر اُس کے سرور سے محظوظ ہو کر ہر صبح خود اس کا لُطف بھول جاتا۔

جلد ہی ثروت نے جان لیا کہ نعیم وہ نہیں جو نظر آتا ہے۔ جیسا خود کو ظاہر کرتا ہے جب وہ اپنے پیار اور سادہ لوحی سے اپنا دیوتا مان بیٹھی۔ اور تب ثروت نے جانا کہ اس کا کھسوٹا ہوا جسم اب زندگی کی فقط وہ بے مایہ حقیقت ہے جو کبھی متاعِ حیات اور سرمایۂ جاں نہیں بن سکتی۔ خود اپنی محبت کی آبرو نہیں بن سکتی۔ انتقام کی تمنّا جوالا کی طرح اس کے اندر بھڑکی مگر پھر بے دھماکہ، بے آواز ختم ہو گئی کہ سچی محبت کے پاس شاید انتقام کا کوئی تصور نہیں ہوتا، قربان ہو جانے کا ایک جذبہ بے لوث ہوتا ہے جو اپنی پامالی کے باوجود اپنے حقوق و تحفظ کے لئے کسی آئینی یا اخلاقی مدد کا طلبگار نہیں ہوتا۔ جو پھر اپنے ہی زخموں میں زندہ رہتا اور انہیں کُرید کُرید کر اپنے وجود اور زندگی کے اُن نقوش کو ڈھونڈنے کی بے معنی و بے سود کوشش کرتا رہتا ہے جو اب زندگی کا حصّہ نہیں رہے۔ متاعِ اصل کھو گئے، کُجلا گئے، بے آب و گیاہ بے ٹھکانہ ہو گئے، اندھیرے بن گئے مگر جو اپنے انحطاط و زوال کی ذمہ داری پھر بھی بوالہوسی کے سر منڈھنا نہیں چاہتے۔ گزرتے ہوئے شب و روز کے ساتھ ساتھ ثروت نے دیکھ لیا کہ نعیم کی زندگی میں اُس کے شوق کا مقام کتنا عارضی اور بے جگہ تھا کہ اُسے

بلکتا چھوڑ کر پھر نعیم فوراً ہی دوسری لڑکیوں کی طرف بڑھ گیا اور اس کی جگہ یکے بعد
دیگرے نئی نئی لڑکیاں لینے لگیں۔ نعیم نے کبھی نہ کہا مگر ثروت نے خود اپنے کرب
کی انگلیوں پر گن گن کر شمار کر لیا کہ کتنی اچھوتی، صبیح، ملیح لڑکیاں، کتنی قیمتی نازنین جوانیاں
سمندر کے کف اور جھاگ کی طرح ساحل تک چڑھ چڑھ کے محض ٹکرا کے اور اپنا سر پھوڑ
کے اُتر گئیں۔ کتنی طوفانی موجیں صرف اپنی خوش فہمی کے تلاطم میں وسعت سمندر سے نکل
نکل کر اُن کوزوں اور آبخوروں میں بند ہوگئیں جو تنگی کے سوا کچھ نہ تھے۔ یہ تمام لڑکیاں،
ایک دوسرے کے حشر سے بے خبر، بے ہنگم دیوانے پن اور نادانی جنہوں سے نعیم
کے ذہین دریچے اور خوب صورت الفاظ کے جال میں چارے کی شوقین مچھلیوں کی طرح
پھنس کر پھڑپھڑاتی رہ گئیں اور ہر بار نئی لڑکی کو پھانس کر نعیم ایک مکڑے کے سے اشتیاق
سے اُس کی طرف لپکا پھر جب ہر لڑکی بے بس مکھی کی طرح جال کی اسیر کر دینے والی تنگی
سے کانپنے کسمسانے، رونے لگی تو وہ فوراً اُسے چھوڑ کر دور ہوگیا کہ پھر اُس سے بھی
بھوکا کوئی اور دریارہ نہ ہی مکڑا آئے اور اس ادھوری مکھی کو فوراً نگل جائے۔

ثروت نے کئی قتل دیکھے اور ہر بار شدت سے چاہا کہ نعیم کو اُس کے کئے کی سزا
دلائے مگر ہر بار وہ بے بس سی رہ گئی۔ یہ اُس کی کمزوری تھی یا خوف وہ خود نہ جان سکی
مگر ٹھیک انہی دنوں نعیم کے مداحوں اور شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ نعیم کے مفادات
سے وابستہ بہترین نمونوں کے طور پر کام کرنے لگا۔ لیکن عرصے تک عورتوں، اُصولوں
اور زندگیوں سے کھیلتے رہنے کے نتیجے میں خود نعیم زبردست تضادات کا شکار ہو چکا
تھا لہٰذا نہ خود اٹل رہ سکا نہ اپنے اردگرد حلقہ کو برقرار رکھ سکا۔ وہ خود منظم اور مثالی
نہ رہا تھا اسی لئے پھر متعدد اختلافات کی بنا پر آخر کار تحریک سے بھی علیحدہ ہوگیا۔
اور اس موقع پر بھی اُس نے اپنے عمل پر اچٹتی سی نظر بھی نہ ڈالی کہ اب اس کے اردگرد
دُور دُور تک فارغ البالی تھی۔ آسودہ حالی تھی۔ زرنگار تابناک زندگی جسے تج کر

کسی اور مقصد کے لئے زندہ رہنا اُسے محض تفنیعِ اوقات معلوم ہونے لگا تھا کہ محفلِ یاراں اور شعلہ رُخاں سے ابھی بہت سی سوغاتیں وصول کرنی تھیں۔ رنگ رلیوں اور رعنائیوں کو اپنانا تھا۔ چنانچہ مقصد کی کھری چوکھٹ کو الانگ کر بھی وہ روشنی امکانات سے دل برداشتہ نہ ہوا اور تمام الزامات کو گرد کے ناپاک ذرّوں کی طرح جھٹک کے مہ وشِ وسیم تن زیست کے جمالی جسم کی طرف پوری شہرت و شوق سے بڑھتا رہا کہ دلِ ابتلا، آفاتِ جہاں، الزامِ زمانہ اور شورشِ ایّام کے ملال اور کبیدہ خاطری کو دیارِ عشق و حسن کی راہ نوردی کے نئے انداز بخشے اور شباب کی حرارت بخش آگ کو جی بھر کر اپنے جسم اور خدوخال پر سلگنے دے کہ جب تک روئے زمین پر ایسی لڑکیاں موجود ہیں جنہیں جنّت کے سُکھوں اور دوزخ کے دُکھوں سے زیادہ مرد کی فکر و طلب ہے۔ مرد کی ضرورت ہے۔ تب تک زیست کے ہونٹوں سے مٹھاس حاصل کرنے کی بجائے زمانے کے نشیب و فراز، عرفان والہام کی تمنّا بھی کس لئے کہ انسان عیشِ جہاں اور عشرتِ زندگی کے لئے ہی وجود میں آیا ہے اور دنیا کوئی خانقاہ نہیں جہاں کا ہر مرد و زن لازمی طور پر راہب ہو۔ آثارِ زندگی اور شوقِ حیات سے بے بہرہ۔

اب تک انیسہ اور نعیم کا تصادم مصلحتوں کا شکار تھا۔ مگر عائشہ کی رخصتی کے بعد سے یہ ٹکراؤ کھلے عام ہونے لگا۔ نعیم نے اب انیسہ کو بھی اپنے انتقام کی زد پر رکھ لیا اور انیسہ نے بھی ضد پکڑ لی لہٰذا دونوں ایک دوسرے کی نفی کرنے میں ہی اپنی مضبوطی سمجھنے لگے۔

نعیم اور اپنے بچوں سے بے فکر انیسہ اپنا ایک راستہ بنا چکی تھی اور اُسے اپنی اُسی شخصیت کی چاٹ پڑ چکی تھی جو حاکم اور خود پسند تھی۔ جو اب کبھی محکوم بننے کے قابل نہ رہی تھی کہ جس طرح قاتل کو پھر خونیں کھیل ہی پسند آتا ہے، خونخوار کو وحشت و درندگی ہی راس آتی ہے۔ آدم خور کو خون کے سوا پھر کوئی اور ذائقہ نہیں جچتا اُسی طرح انیسہ کو بھی فرق نعیم اور اُس کا گھر ہی نہ چاہیئے تھا بلکہ وہ دنیا، جہاں وہ حُکمرانی کر سکے۔ چنانچہ بے حد

رہ جائی بنی وہ اپنی ہی ذات میں گم تھی اور اُس اعزاز کی بے حد منتظر جو اُس کی اپنی دانست میں اُسے بہر حال ملنے والا تھا کہ رابعہ کچھ زیادہ ہی بیمار ہو کر اُس کے پاس آ گئی۔ گھر پر اُس وقت نہ انیسہ تھی نہ نعیم لہٰذا رابعہ بچوں میں گھری رہی پھر جب نعیم لوٹا تو رابعہ کو دیکھ کر حیرت سے بولا: "تم! رابعہ تم؟"

"ہاں"! رابعہ نے مدہم آواز میں کہا اور نظریں جھکا لیں۔

نعیم نے بچوں کو رابعہ کے پاس سے چلتا کر دیا اور مغموم آواز میں بولا: "افسوس تمہیں کونسی دیمک چاٹ گئی رابعہ؟ ذرا اپنی حالت تو دیکھو۔"

اور اس ہمدردی پر رابعہ کی جھکی ہوئی آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں مگر اُس نے سسکیاں روک کر نظریں اُٹھائیں اور شکایتی انداز میں بولی: "مگر آپ تو ذرا بھی نہیں بدلے بلکہ اور صحت مند اور اچھے ہو گئے ہیں۔"

نعیم پہلے تو ترنگ میں مسکرایا پھر دفعتاً خود پر درد و غم طاری کر کے بولا: "میرے دل میں جھانک کر دیکھو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ میں نے کتنا غم سمیٹا ہے؟ تمہارا غم رابعہ! صرف تمہارا غم!!" اور اُس کی بے درد نظر رابعہ پر سے پھسلتی ہوئی اُس ماضی پر جا ٹکی جہاں رابعہ کی قربت سے ہی پہلی بار رنگ و نور کی بارشیں ہوئی تھیں۔ عطر بیز نسیم گل بداماں چلی تھی تب ہر موسم خوبصورت تھا۔ خواہشات کے بادل ایسا جھوم کے برسے تھے کہ آبشارِ لطافت کے تسلسل اور ترنم سے، احساسِ شباب کی حشر سامانیوں سے، جذباتِ جمیل کی ضو فشانیوں، رعنائیوں سے وجود کا بوٹا بوٹا دمک کر، مہک کر رہ گیا تھا۔ ایسا خوبصورت حشر ایسا دل آویز ہنگامہ برپا ہو گیا تھا کہ ایوانِ دل، ایوانِ جسم، ایوانِ ذہن و حیات گونج کر رہ گئے تھے۔ تمام زندگی فقط ایک نغمہ بن گئی تھی اور تہی داماں نعیم نشاط کے آئینے میں پوری گستاخ نظری اور شرارت سے رابعہ کی مہر و محبت، التفات و کرم، تازگی و شادابی کو نظر بھر کر جانچنے، پینے لگا تھا۔ اپنی واماندگی سے گزر کر، کون و مکاں کو بھول کر غنچوں کے رس

کی طرح رابعہ کے بالیدہ وجود کو اپنی خواہش کے خوب صورت گلاس میں بھرنے، اپنی طلب کے ایاغ میں گھولنے، اپنے پیالۂ جاں میں انڈیلنے، آسمان میں اُڑنے لگا تھا اور رابعہ بھی اُس کی پہلی پہلی پیاس بجھانے بہ شوق تیار ہو گئی تھی مگر کیا یہ سب باتیں ماضی کی تمام بے پناہیاں، پچھلی تمام لذتیں، لطف، شوق، بانکے شوخ جذبے اب تک خود رابعہ کو یاد ہیں یا وہ سب بھول بھال گئی؟ محبت کا وہ تمام طلسم، قصرِ ارمان کی وہ تمام رونقیں اور جمال!

یادوں کے تمام روشن حسین چاند نعیم کی گجلائی ہوئی یادداشت پر از سرِ نو اُبھر اُبھر کر چمکنے اور اس طرح ضیا پاشی کرنے لگے کہ عہدِ رفتہ کا ہر مرحوا بستہ لمحہ چلا چلا کر نعیم سے کہنے لگا: او بے رحم! او بے رحم تو رابعہ کو بھول گیا۔ اپنے شوق کے نئے راستوں پر نکل کھڑا ہوا! مگر کیا رابعہ بھلائی جا سکتی ہے؟

کچھ خوف، خلش گو مگو کے ساتھ ماضی اور اپنے تحت الشعور کے دھندلے مقبرے سے نظریں ہٹا کر نعیم نے پھر دو بد و ٹھہری ہوئی رابعہ کی اجڑی ہوئی دوشیزگی، کاہیدہ بدنی اور نمناک آنکھوں کو بڑے والہ و شیدا انداز میں دیکھا مگر وادیٔ جمالستان کی جی بھر سیر کر لینے، بے شمار دوشیزاؤں کو ہڑپ کر لینے کے باوجود اب اس وقت بھی رابعہ سے وفا کا پُر تپاک خیال نعیم کے ذہن و دل میں نہیں آیا۔ بلکہ تمام گزرے ہوئے واقعات اور اپنی تمام، حالیہ کارستانیوں کو پھلانگ کر عہدِ رفتہ کے گزراں چہیتے لمحوں کے گلے میں پھر اپنی حرص، و ہوس کی باہیں حمایل کرنے وہ کچھ ایسی شان اور تزک و احتشام سے آگے بڑھا کہ اُس کی ٹوٹی پھوٹی تیڑھی شخصیت کے تمام بھونڈے اور زنگ اُترے ٹکڑے ایک اولٰے خاص اور احتیاط سے جُڑنے، یکجا ہونے لگے۔

وسعتِ ارماں، جذبۂ جولاں نعیم کو پُکارنے، للکارنے لگے۔ رابعہ کے معصوم، و مظلوم آنسوؤں کو پھر دھوکا دینے پھر اپنی آغوشِ ہوس میں سمانے، خوبصورت شب کی خوبرو شب بسری کو تھام تھام لینے وہ دیوانگی سے جھکا اور رابعہ کی لرزاں ٹھوڑی

کو تھام کر بھولی ہوئی حلاوت و شیرینی سے بولا: "تیرا شباب پگھل گیا تو کیا ہوا۔ تو بھی تو جوں کی توں ہے بگی۔ جذبات کی سطح پر اب تک ویسی ہی معصوم اور مقناطیسی، جیسی اپنے زندہ اور بھرپور شباب میں تھی۔ تیرا جسم غرور کیرٹے کی نذر ہو گیا، تیرا سراپا مئے حیات سے خالی لاغر و نحیف مگر تیری فطرت ہنوز ویسی ہی پُرکشش جاذب اور اس دلداری سے رابعہ کے آنسو، اُس کے درد کی آنکھوں میں فوراً خشک ہو گئے، سوکھ گئے۔ تب بہ نہ جم کر اس طرح سلگنے ایسی عجیب روشنی دینے لگے کہ رابعہ کے بیمار اور سوگوار خدوخال سونے کی طرح سنہرے ہو گئے۔ افسوس والم کے مضبوط شکنجے کے گہرے دباؤ سے چھوٹ کر اس کا پژمردہ چہرہ زر و جواہر کی طرح لو دینے دمکنے لگا۔

ہائے کتنے زمانے سے وہ ایسی گفتگو کا مزہ بھول بسر چکی تھی مگر اب پھر آبدار موتیوں کو جھلکتے، آرزوؤں کے شگوفوں کو خود اپنی طرف جھکتے، خود پر مچلتے پا کر وہ انہیں چُن لینے جمع کر لینے بے تاب ہو ہو گئی۔ بیتے دِنوں کا ہر بند روزنِ دل وا ہونے لگا۔ بوئے گُل پھر اسے مست کرنے لگی۔ تمام شہد بھرے سوکھے جھرنے پھر اس کی بیمار ناتواں ذات میں چھما چھم بہنے رقص کرنے لگے حتیٰ کہ خوبصورت یادوں تلے پرائی رابعہ بھی بے اختیار پُرانے میٹھے دِنوں کو اپنی یاد کے کلیجے سے لگاتے اور بڑی خود ساختہ ہمت سے اپنے نوخیز ارمانوں کے سینے میں گھونپی گئی وہ چھری نکال لینے کی کوشش کرنے لگی۔ جس کی چبھن اور درد کو سہتے سہتے مدت گزر گئی تھی۔ جس کی ٹوک کو محسوس کرتے کرتے وہ ہر خوشگواری کو محسوس کرنا، خوش اور مسحور رہنا بالکل بھول بھال گئی تھی مگر اب اس کے ٹھٹھرے، پالا کھائے ہوئے وجود میں پھرتی اور صحت مندی کی جرأت عرصہ ہائے دراز بعد دفعتاً ہمت سے ہلکورے لینے لگی۔ شدت سے مچلنے لگی، تیزی سے اپنی طوفانی بہجت سے بغلگیر ہونے لگی۔ ایک ناگاہ وار نے رابعہ کی خوشی کا خاتمہ ضرور کر دیا تھا۔ مگر اب ــ وقت کے اس خواہش [illegible] جیسے [illegible] طاقت [illegible] توانائی سے شکست کھا کر خود بکھر گیا۔

درد کی چھری اُس کی زندگی کے سینے سے نکل کر کہیں دور جا پڑی اور رابعہ تم پچھلی زندگی کی تمام یکا نگت کچھ ایسی بے محابا چھا گئی کہ زمانۂ حال اُس کے لئے بے معنی بن گیا جیسے اس کا بیاہ اس کے بچے اس کی ساری مسائل زندگی محض ایک دھوکا فریب ہو۔ کوئی طویل غیر فطری خواب جس کی بے رحمی سے ڈر کر وہ بالآخر چونک پڑی ہو اور جاگ کر جس گے اثر کی بوجھل برفانی سل حقیقت کے سینے سے ہٹانے، سرکانے لگی ہو۔ اپنے خوف سے بدلا کہنے لگی ہو کہ میں فقط وہیں زندہ ہوں جہاں میری محبت دفن ہے۔

عین اُسی وقت انہی لمحوں میں تاخیر کا ایک عجیب مہمل سا احساس نعیم کو پراگندہ کرنے لگا۔ دیر کیوں ، دیر کیوں ؟ اُس نے خود سے کہا اور دفعتاً رابعہ کو جکڑ لیا۔ مگر محبت کے اونچے بام اور رفعتوں کے فلک پہ پہنچی ہوئی رابعہ تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔ اُس نے پوری بے تحاشگی سے اپنی یادوں کی تمام روشن پھلجھڑیاں سمیٹیں اور پوری جسارت سے اُن کی روشنی پہ اپنا حقیقی ہاتھ رکھ دیا۔ تب اُس بپھری ہوئی شیرنی کی طرح جو زخمی حالت میں بھی اپنے بچوں کی حفاظت سے غافل نہیں رہتی رابعہ نے ایک بھرپور تھپڑ نعیم کے منہ پر دے مارا اور اپنی آنکھیں اس طرح اوپر اُٹھائیں کہ ان کا تمام سلگتا ہوا جوش و جلال بے نقاب و عیاں ہو گیا۔ نعیم نے شدت یاس سے محسوس کیا کہ یہ کسی مشتاق، متمنی، محبت بھری لڑکی کی طلسمی ہوش رُبا آنکھیں نہیں۔ یہ اُس کی رابعہ کی آنکھیں بھی نہیں بلکہ یہ تو صرف اُس عورت کی آنکھیں ہیں جو فقط ماں ہے۔ جسے اپنا سہاگ عزیز ہو یا نہ ہو مگر اب کوئی اور لمس، محبوب سے محبوب عنوانِ حیات بھی قبول نہیں تب کوئی نامعلوم غضبناک گرفت نعیم کو بالکل اپنے حلقوم پر محسوس ہوئی۔ اپنے پوشیدہ خون آشام ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹتی ہوئی اور نعیم تھرا کے پیچھے ہٹا۔ اپنے ہاتھ بڑے اضطراری انداز میں ٹیک کے بڑی معذرت اند رقت سے بولا :

"معاف کر نا رابو، معاف کرنا مجھ سے بھول ہو گئی۔ مجھے یاد نہ رہا کہ اب

ہم بیتے زمانے میں نہیں۔ حال کے دوراہے پہ کھڑے مختلف سمتوں میں بٹے ہوئے ہیں، اور تم نے مجھے فراموشی کی اُس کھائی میں پھینک دیا ہے، جو نظر نہیں آتی مگر جہاں پھڑپھڑا کے دم توڑ دینا ضروری ہوتا ہے۔ وہ پھڑپھڑانے والا اب میں ہوں اور وہ خطرناک کھائی تم خود ہے یقین ماننا میرے ہاتھ دانستہ تمہارے گلے میں نہیں پڑے۔ بلکہ اپنے آپ اُس محبت کے گلے میں پڑ گئے تھے جو کبھی میری تھی مگر افسوس اب شاید میرا کچھ نہیں رہا۔ میں خانماں برباد، خانہ خراب رہ گیا ہے۔"

نعیم نے اپنی مکار نگاہیں رابعہ پر سے یکلخت ہٹالیں اور قدرے گھوم کر اپنی آنکھیں اس طرح ملنے، رگڑنے لگا جیسے اپنے آنسو رابعہ سے قصداً چھپانا چاہتا ہو۔ حالانکہ غصہ سے کانپتے ہوئے اُس کے ہاتھ رابعہ کے اجتناب و انحراف کا گلا گھونٹ کے رکھ دینا چاہتے تھے۔ رابعہ کے بیاہتا غرور کو کچل مروڑ کے کسی ردی کاغذ کی طرح پھینک دینا چاہتے تھے مگر وہ خود کو ایک بہترین اداکار ثابت کرنے لگا اور جو کہتی رابعہ اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔ ایک ماں کے ہاتھ کی اُس بے دھڑک جسارت پر شرمسار ہونے لگی جو نعیم کے رخسار پر ہی نہیں بلکہ خود اُس کی اپنی محبت کے منہ پر بھی ایک چوٹ کی طرح پڑ گیا تھا۔ نعیم کی ندامت رابعہ کا دُکھ دھونے لگی۔ وہ سوچنے لگی۔ یہ شخص میرے وجود کی تہوں، پرتوں، پردوں سے نکل کر کہیں بھاگ کیوں نہیں جاتا۔ مجھ سے روپوش اور اوجھل کیوں نہیں ہو جاتا۔ اتنی دور ایسی جگہ کیوں نہیں چلا جاتا جہاں میرا تخیل تک پر لگا کر نہ پہنچ سکے کہ ایک عورت اپنے وجود میں سب کچھ بھر سکتی ہے۔ عفونت، گندگی، غلاظت تک۔ اپنے وجود سے سب کچھ تج سکتی ہے۔ روشنی، امارت، حلاوت تک مگر ایک ماں اپنی ممتا کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ کبھی پشیمان، منفعل نہیں دیکھ سکتی۔ اپنے بچوں کے مستقبل پہ کیچڑ نہیں اچھال سکتی۔

تب رابعہ نے اپنی چشمِ پُرنم بھول کر بڑے فخر سے اپنی ممتا کو دیکھا۔ اپنی دیرینہ، اور آگاہ محبت سے علانیہ کنارہ کشی کو محسوس کیا اور اُسے کسی کا یہ کہا بے اختیار یاد آیا کہ:

"خدا اپنے مغموم بندوں کو صرف اُن کے محبوب غموں سے ہی پہچانے گا۔ اُن زخموں
سے جو انسانیت کو میلا گدلا کئے بغیر اُن کے جسموں اور روحوں کے تاج بنے۔"

یقیناً یہ ادراک رابعہ کی عقل و فہم اور محسوسات کا نہ تھا بلکہ اُس مدبر ماں کا ادراک
جو اپنی طلب کی آسودگی کے لئے اپنے فخر کا ناس نہیں کر سکتی۔ اپنی ممتا کو رسوائی اور غارت
گری کے حوالے نہیں کر سکتی لہٰذا نعیم کے نرم و غمگین الفاظ کا تمام ریشم اور اس ریشم کا
لطیف و مہین لمس تار تار ہو کر اس کے احساس پر سے سرک گیا۔ منوّر الفاظ کے تمام تراشیدہ
بُت کسی دیو کی طرح بدشکل بدنما بُرے محسوس ہونے لگے۔ رابعہ کے تمام نازک اور حساس حصے
ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے سے بچ گئے۔ اُس نے بڑی بردباری اور منجمد خاموشی سے نعیم
کی شخصیت کے تمام سحر کو۔ الفاظ کے تمام زرّین حسین سنگ ریزوں کو اپنے دامنِ شوق
سے الٹ ڈالا کہ رابعہ نے خواہ کتنے بھی دھوکے کھائے ہوں مگر اب ممتا کی متانت و
شوکت اور ممتا کی ابدی بصیرت کوئی دھوکا قبول نہ کر سکتی تھی اور محبت کی ماری کوئی دوشیزہ
خواہ اپنی کتنی ہی قبریں بنائے مگر ایک ماں اُس تربت کی کبھی خواہشمند نہیں ہو سکتی جو خوشبو
کے نذرانے لئے معتقدین اور مداحوں سے گھری ہی سہی مگر جس میں کوئی بے گناہ مطمئن روح نہ
سوتی ہو اور وقت کے اُس اہم حصے میں رابعہ فقط ماں ہی ماں رہ گئی تھی۔ ماں جو نادان
اور بھولی ہو کر بھی دانا ہوتی ہے۔

اور ایک سخت مقام سے کامیاب گزر کر وہ ایک ماں کو تو بے شک بچا لائی
تھی مگر کمندِ ہوش و حواس سنبھالے رہنے اور رفعتِ افلاک پر محوِ پرواز ہونے کے باوجود اُس
گلنار، گل رخ دوشیزہ کو ہنوز حریمِ شوق کی چوکھٹ پر سجدہ ریز چھوڑ آئی تھی جو اپنے جذب کی
عمیق ترین پنہائیوں میں اسیر ہزار پناہیں ڈھونڈ کر بھی اپنے نا تمام وجود کو تمام کرنے کے لئے
فقط اپنی محبت کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس واقعہ نا خوش گوار کے پیش آ جانے کے
باوجود رابعہ کے ہلدی جیسے پیلے رخسار تیزی سے اپنا رنگ بدلنے لگے۔ اُس کی ملتجی مغموم

نگاہ یک بیک لو دینے لگی۔ آلام قفس اور آداب قید و بند کی شدید صعوبتوں اور صبر و ضبط کے تشوا تشو امتحانوں کے باوجود اس کا پھیکا، میلا میلا چہرہ مہر و ماہ کی طرح دلکش، دلنشیں، دلشاد نظر آنے لگا۔

انیسہ پھر تڑپ تڑپ اٹھا کرسوچنے لگی کہ یہ کیسی صحت مندی ہے جو اس بے نام و نشان، خود رفتہ، مدفون چہرے پر پھر ایک رنگ بکھیرنے ایک روغن پیدا کرنے، جشن چراغاں کی سی کیفیت جگانے لگی ہے۔ بہار کی سی خوشگواری ابھارنے لگی ہے۔
اگر انیسہ نے کبھی ایسی محبت کی ہوتی تو وہ ضرور جان لیتی کہ مسرت، محبوبیت کیسی جاں بخش، حیات آفریں، نو بہار قوتیں ہوتی ہیں جو مضراب کی طرح بے جان تاروں سے تک نغمے چھلکوا دیتی ہیں پھر رابعہ تو انسان ٹھہری۔ اگر کوئے بتاں میں دوبارہ پہنچ کر وہ پھر چراغ اور بہار بننے لگی ہے، شادابی شگفتگی پانے لگی ہے تو مقام حیرت و تعجب کیسا، کہ ساز نہ بھی جانے تب بھی مطرب و فنکار انگلیاں تو ضرور جانتی ہیں کہ کب اور کیسے کونسا نغمہ پیدا ہو سکتا ہے اور حرف قربان ہونے والا ہی جان سکتا ہے کہ حدیثِ دل، حدیثِ شوق، حدیث آرزو کا فسانہ کتنا ہی خونچکاں، خونناب سہی مگر خود میں کتنی لپک اور حرارت رکھتا ہے۔ ارمان و اخلاق سے عرفان تک کا فاصلہ کتنا ہی سخت صبر آزما سہی مگر پھر بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ جہانِ محبت میں ادبار و اقبال کے راستے کیسے ہی پُر پیچ سہی پھر بھی قابل قدم ہوتے ہیں کہ ہر راہ رہگذر نہ سہی ہر گوشۂ آرام محل نہ سہی تاہم محبت کے راہی اٹل ہوتے ہیں کہ تیرہ و تار اندھیروں میں بھی زیست کا عنوان حاصل کر سکیں۔ مگر انیسہ حیات کے پیچ و خم نہ جانتی تھی لہذا اکتا کے اُس نے مزید سوچنا بھی ترک کر دیا کہ لاحاصل پھندوں میں پھنسنے سے کیا فائدہ اب نہ اُسے نسیم سے کوئی اُمید تھی نہ رابعہ سے کوئی خاص دلچسپی مگر اس سلسلہ میں بہے ہوئے اپنے پہلے پہلے آنسو ضرور یاد تھے۔ بلکہ یہ آنسو جیسے اُس کے تحت الشعور اور ذہن میں کہیں اٹک کر پھنس کر رہ گئے تھے اور درمیانی طویل وقفہ اور فراموشی کے متعدد گذراں لمحوں

کے باوجود۔ خود اپنی اُمیدوں اور مسرتوں کے باوجود اُسے ہمیشہ جن سے ہمکنار کر دیتے تھے
مدت ہوئی اپنے حوصلوں کی گرمجوشی اور استقبال میں وہ انہیں بھول بھال گئی تھی۔ مگر جیسے
ہی رابعہ آئی اُسے سب یاد آگیا اور سخت کوفت ہوئی اُس نے چاہا رابعہ کو لوٹا دے۔ مگر
رابعہ کی ناتوانی آڑے آگئی۔ اور پھر نعیم سے اپنی لاتعلقی کا احساس بھی رابعہ کے لئے رحم بن گیا اور
وہ چپ رہ گئی مگر بھولی رابعہ اپنی پچھلی سج دھج کھو کر بھی اپنی اسیری پہ قانع اپنے خانۂ دل کو ہنوز
نرم نگاہی سے دیکھ رہی تھی۔ ایک پیکرِ سنگ کو اپنے کلیسائے دل کی سب سے پاک پوتر
مقدس جگہ دے چکی تھی اور یہ جاننے ماننے کے لئے تیار نہیں تھی کہ وہ سنگ دل قصرِ دل میں
جگہ پانے کا اہل نہیں۔ نرا پتھر۔ یہ جو راہیں اور سمتیں تو ضرور مقرر کر سکتا ہے۔ سطحِ آب کا
رُخ بھی پلٹ سکتا ہے۔ مکان محل، قلعے فصیلیں ضرور تعمیر کر سکتا ہے مگر منزل نہیں بن سکتا۔
جس کے پیراہن کا اطلس و کمخواب بھی تنگ دامانی اپنے گھیراؤ میں کوئی وسعت نہیں رکھتا بلکہ
شاید اُس کفن کی طرح ہوتا ہے جو ہوا یا روشنی کے لئے خود میں کوئی گزر یا گنجائش نہیں رکھتا
مگر رابعہ اپنے ہی جذبے میں زندہ تھی اور اس پتھر کو اپنے صنم خانۂ جاں اور کعبۂ دل میں
جما چکی تھی اور لپیٹے اصلی پیراہن کی بجائے اس کفن کو ہی اپنے اطراف لپیٹ رہی تھی جو اُسے
ہر پیاری آنکھ اور فراخ رفاقت سے دور لے جا سکتا تھا۔ گمنام گہرائی کے حوالے کر سکتا تھا۔
مگر نہ رابعہ کو ابھی پتھر سے تصادم کا نتیجہ معلوم تھا نہ کفن کی تنگی اور کوتاہی کا کوئی اندازہ،
وہ نعیم کی خجالت کو سچائی سمجھ کر اُسے دل سے معاف کر چکی تھی اور کوئی تجزیہ کئے بغیر یہ
سمجھنے پر مجبور کہ جو کچھ ہوا وہ ایک بے اختیارانہ حرکت تھی اور پچھلے روابط کی آئینہ دار
مگر نعیم اس طرح نہیں سوچ رہا تھا۔ جراتِ شوق کے اعادے رابعہ کے اجتناب و
انکار کے بعد نعیم کی محتاط خاموشی اور دوری اُس گھنے ناقابلِ گزر جنگل کی صورت اختیار کرنے
لگی جو اپنے خونخوار مکینوں کے پلنے، پنپنے کا جواز ضرور رکھتی اور انہی کی بقا کے لئے ضروری ہوتی ہے
انہی کی رہائش کے لئے موزوں و مناسب۔ کہ جنگلی وحشیوں درندوں کے لئے مخصوص

ہوتے ہیں۔ اور آباد مقامات انسانوں کی تہذیب کے لئے مگر کچھ انسان بہیمیت، بربریت
کے عادی پُرعافیت مقامات سے لُطف اندوز نہیں ہوسکتے۔ وہ اپنی درندگی میں ہی اپنی
آسودگی محسوس کرتے ہیں لہٰذا نعیم بھی بھوکے بھیڑیئے کی طرح موقع کی تاک میں تھا۔ اُس
رابعہ کا نشانہ لے رہا تھا جو اپنے حسین و جمیل بے پناہ خیالات کو پورے جتن سے اپنی
تمنّا کے طرحدار وجود میں پال پوس رہی تھی۔ اور اپنے اس عمل کو اپنی شخصیت کا سب سے
رجائی حصّہ سمجھ کر مطمئن اور خوش منازلِ تقدیر و مرحلۂ حیات طے کر رہی تھی اور کسی جنگل یا حملہ
آور سے واقف نہیں تھی جو اپنی زندگی میں مردہ تھی۔ مگر اپنی محرومی میں زندہ۔ جیسے یہ بھی
معلوم نہیں تھا کہ بپھرا ہوا یا بگڑا ہوا ردِ عمل کیسا ہوتا ہے۔ اُس نے کبھی کبھار پرندوں کے
شکاری دیکھے تھے اور بس ــــ

انیسہ عموماً گھر پر نہیں ہوا کرتی تھی اور کسی کسی شام سارے بچّے بھی غائب ہوجاتے
تھے مگر چونکہ ہر شام رابعہ کا دولہا پابندی سے آجاتا تھا لہٰذا وقت کسی نہ کسی طرح کٹ ہی
جاتا تھا۔ رابعہ کو تنہائی کی سوگواری محسوس ہی نہ ہوتی تھی۔ ویسے بھی وہ اتنی سوگواری سے
گزر چکی تھی کہ اب اُسے کسی بھی حالت سے خوف نہ محسوس ہوتا تھا۔ مگر ایک شام عین
اپنے دولہا کے آنے کے وقت جب اُس نے نعیم کو حالتِ نشہ میں، اپنے بالکل قریب
پایا تو بے تحاشہ بوکھلا گئی۔ نعیم کو نشے میں وہ پچھلے کئی دنوں سے دیکھتی آرہی تھی۔ مگر
ایک مرتبہ کے بعد اُس نے کبھی کوئی حرکت ایسی نہیں کی تھی جو رابعہ کو خائف کرتی بلکہ رابعہ
کے اجتناب کو محسوس کرلینے کے بعد سے وہ قصداً جیسے اُس سے علیحدہ ہوگیا تھا۔
اور رابعہ نے لاکھ اُسے اپنے دل میں جگہ دے رکھی تھی۔ مگر نعیم نے کبھی یہ ظاہر نہیں کیا
تھا کہ وہ رابعہ کی حقیقت سے واقف ہے بلکہ پھر وہ خود اُس سے دُور دُور
بھاگتا نظر آیا تھا مگر اس وقت ــــ

"کیا بات ہے؟" رابعہ نے خود کو سنبھال کر پوچھا۔

نعیم جواب دینے کی بجائے مسکرایا۔

"چلے جائیے۔ خدا کے لئے جائیے"۔ رابعہ نے التجا کی۔

نعیم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ "بعض شرابیں ایسی ہوتی ہیں رابعہ جو انسان کو بے خود کر دیتی ہیں۔ اگر یقین نہیں آتا تو تھوڑی تم بھی پی کر دیکھو۔ تم بھی خود کو بھول جاؤ گی۔ کوشش پر بھی یاد نہ رکھ سکو گی اور تب تمہیں ہر طرف میں ہی میں نظر آؤں گا"۔ وہ تیزی سے رابعہ کی طرف بڑھا۔ "کیا کر رہے ہیں آپ؟" رابعہ چلائی مگر نعیم نے گلاس رابعہ کے منھ سے لگا دیا۔ ٹھیک اسی وقت پردہ ہٹا اور رابعہ کا دولہا کمرہ میں داخل ہوا۔

"رابعہ!" ــــ وہ دہاڑا۔ نعیم یکلخت پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" رابعہ کے دولہے نے چلا کر پوچھا۔ وہ سر سے پیر تک کانپ رہا تھا۔ "جی ــ! ــ جی ..... رابعہ ہکلائی۔ مگر نعیم لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں مسکرا کر بولا: "کچھ نہیں رابعہ شراب پی رہی ہے"۔

رابعہ کا دولہا ایک جست میں رابعہ پر جا پڑا۔ "میں آج تمہارا گلا گھونٹ دوں گا"۔

"ارے، ارے" نعیم اسے گھسیٹتا ہوا بولا: "شراب پینا ایسا قصور نہیں، جس کی سزا موت ہو"۔

رابعہ کا دولہا نعیم سے لپٹ گیا۔ "تم بھی اپنی موت کے لئے تیار ہو جاؤ"۔

"مگر بھائی صاحب اس کے بعد خود آپ کی موت بھی واقع ہو جائے گی۔ ذرا، صبر سے کام لیجئے۔ میں تو خیر روز ہی پیتا ہوں۔ مگر رابعہ آج پہلی مرتبہ ....

"تو اسی لئے تم یہاں آئی تمہیں رابعہ کہ ـــ کہ ....." وہ شعلہ بار نظروں سے رابعہ کو گھورنے لگا۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اب رابعہ کے ساتھ زندگی بھی ناممکن تھی۔ اس کے ہاتھ پیر کل شوج ہوا کانپ رہا تھا۔ مگر ضبط کر کے اس نے خود کو سنبھالا اور ذرا سنبھل کے بولا: "ٹھیک ہے میں خود بھی قاتل کہلانا پسند نہ کروں گا مگر تم اب کبھی

میرے گھر نہیں، لوٹو گی رابعہ۔ تم آج میرے لئے مر گئیں۔" اتنا کہہ کے بغیر رابعہ پر دوسری نظر ڈالے وہ لوٹ گیا۔

تب نعیم نے آگے بڑھ کر رابعہ کو تپاک سے سہارا دیا اور گلوگیر آواز میں بولا:

"یہ کیا ہو گیا؟ میں نے تو سوچا بھی نہ تھا اور نشے کی ترنگ میں، میں بالکل بھول گیا کہ یہ وقت بھائی صاحب کی آمد کا ہے۔ اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا؟ دراصل یہ شراب ہی خراب ہے۔" اُس نے گلاس فرش پر پٹخ کر پھوڑ دیا۔ اور کرسی پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا منھ چھپا لیا۔

رابعہ دیر تک ساکت خلاؤں میں گھورتی رہی۔ اُس نے اپنے شوہر کو روکنا چاہا تھا مگر نہ روک سکی۔ کچھ کہنا چاہا تھا مگر نہ کہہ سکی اور اب وہ نعیم کی آواز بھی سُن رہی تھی مگر اس کا ذہن الفاظ اور معنی مطالب قبول کرنے سے قاصر تھا۔ صرف بھنبھناہٹ تھی جو اس کے کانوں میں مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہی تھی۔ ورنہ اس کا سارا وجود بے جس بے جان ہو چکا تھا۔ اپنی اس حالت میں اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ نعیم کب چلا گیا اور وہ تنہا رہ گئی۔ کافی دیر بعد جب وہ اپنے حواسوں میں واپس آئی تو سب کچھ سوچ کر سکنڈوں کے قلیل عرصے میں نفرتوں کے کئی طوفانی اُس پر سے گزر گئے۔ اگلے ہی روز رابعہ کے شوہر نے رابعہ کو بد چلنی میں ماخوذ کر لیا اور اُسے ایک سخت خط لکھا کہ اب وہ اُس کی ساتھی کہلانے کے قابل نہیں رہی لہٰذا کبھی واپس نہ لوٹے۔ جہاں ہے وہیں رہ جائے اور بچوں کو بھی اُس نے فوراً رابعہ سے چھین لیا۔

اتنی بے عزتی، اتنی زبردست اور اچانک تبدیلی کے لئے رابعہ ہرگز تیار نہ تھی۔ وہ شرم سے کٹ کٹ گئی۔ اپنی صفائی کے لئے اُس کے پاس الفاظ بھی نہ رہے تھے۔ کچھ کہنا بیکار تھا۔ انیسہ کے پاس قیام کے دو ہفتے اُس کے احساس پر سے پھولوں کی طرح گزر چکے تھے۔ مگر تیسرا ہفتہ ایک کٹار کی طرح اس کے سہاگ کے سینے میں پیوست

ہو چکا تھا۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ بچوں کے بغیر وہ جی بھی نہ سکی تھی۔ وہ سوچ بچار
کی عادی نہ تھی۔ مگر اُس رات اُس نے سوچا۔ میں اپنے بچوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں
رہی اور آنسوؤں کا سیلاب اس کے سارے وجود کو بھگو گیا۔ زندہ رہنا اُسے بے
وہ فضول، بڑا مشکل معلوم ہوا۔ چنانچہ خوب تڑپنے، خوب رو لینے کے بعد اُس نے چپکے
سے اپنی انگوٹھی کا ہیرا پیس کر پھانک لیا اور صبح ہوتے ہوتے بالکل بے آواز ہو گئی۔ صرف
رات نے اس کے آنسو دیکھے۔ صرف تنہائی نے اس کی تڑپ اور جانکاہی۔۔ زندگی
اور موت کی کشمکش ورنہ سارا گھر مزے کی نیند سو رہا تھا اور کوئی اُن سسکیوں، ہچکیوں
بے قراریوں سے واقف نہ تھا جو رابعہ کے مظلوم وجود پہ سے گزر گئیں۔ صبح جب
انیسہ کو پتہ چلا تو وہ بے حد سراسیمہ ہوئی۔ اُس نے سوچا بھی نہ تھا کہ رابعہ یوں مر جائے گی!
نعیم کو وہ کافی بُرا بھلا کہہ چکی تھی مگر رابعہ کی موت کے بعد اُس نے ہوشیاری سے سارا معاملہ
دبا دیا۔ اور یہ سچ تھا کہ وہ بہت رنجیدہ ہوئی تھی۔ بہت روئی تھی مگر اندر ہی اندر وہ کہیں
مطمئن بھی تھی۔ لیکن اس سارے خطرناک کھیل میں افسوس کا ایک دھبہ یا آنسو کی ایک بوند
تک درد و پشیمانی بنکر رابعہ کے ایسے انجام پر نعیم کی ذات میں نہ جگہ پا سکی۔ بلکہ وہ تو
یوں بے فکر ہوا کہ سب سازشوں میں سے سوچ سوچ کر اُس نے جو سازش سزا کے
طور پر رابعہ کے لئے منتخب کی تھی وہ کامیاب ترین ثابت ہوئی۔ چنانچہ اپنے انتقام پہ۔
نازاں پھر اُس نے رابعہ کے بارے میں سوچا تک نہیں اور کچھ عرصے کی مصلحتاً خاموشی
کے بعد روز و شب کے گھوڑوں پر سوار پھر مسرور و شادماں ہنگام جنوں کی طرف بڑھ
گیا۔ دادِ طرب لیتے دادِ طرب دینے گے اب اس کی زندگی بس اس کے سوا رکھا ہی
کیا تھا۔ مگر دولت کوئی قارون کا خزانہ تو تھی نہیں جو سدا اپنا منہ کھلا رکھتی۔ خرچ ہو
ہو کر بھی نہ گھٹ سکتی۔ ایک جائیداد ہی تو تھی جو سنبھالی جاتی تو سنبھلی بھی رہتی۔ لیکن نہ انیسہ
کو خرچ کرنے سے فرصت تھی نہ نعیم کو۔ لہذا آخر کار رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آ گیا کہ

پیسے کی کمی نے انیسہ اور نعیم کو چبانا شروع کر دیا۔ روزمرہ اخراجات کے ساتھ بے شمار بلز ایسے بھی تھے جو بھرم میں ادا نہ ہوتے تھے مگر خوش حالی کی ساکھ ختم ہوتے ہی تقاضے بن بن کر جان کا روگ ثابت ہونے لگے۔ پہلے تو نعیم انیسہ عادتاً ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتے رہے۔ مگر پھر انہوں نے سر جوڑے اور آپسی اختلافات بھول کر مقابلے کی موثر تدبیریں تلاش کرنے لگے۔ لیکن تدبیریں یا لتو چڑیاں تو تھیں نہیں جو بلاتے ہی فوراً ہاتھ پر آ بیٹھتیں لہٰذا دونوں کی من پسند زندگیوں کو جیسے دفعتاً بریک لگ گئے اور رونق دیکھتے ہی دیکھتے ان کی کوٹھی سے دوسری وسیع عمارتوں میں منتقل ہونے لگی۔ نعیم، انیسہ حیات کی دہلیز پر تنہا بہ تقدیر سرنگوں کھڑے رہ گئے۔ کہ کوئی تو مداوائے غم بنکر آئے مگر کوئی مشکل کشا نہیں آیا اور صرف نعیم کی تنخواہ گھر آتی رہی جو اتنے پھیلے ہوئے بکھیڑوں کے لئے قطعی ناکافی تھی۔ انیسہ پریشان ہوگئی مگر نعیم نے ہمت نہ ہاری۔ اس ناگفتہ بہ صورتِ حال کے انسداد کے لئے کافی سوچ بچار کے بعد اُس نے ایک راستہ پکڑ ہی لیا اور انیسہ کو یقین دلایا کہ نہ گھبراؤ اچھے دن جلد ہی لوٹ آئیں گے۔ وہ اِس وقت انیسہ پر پھر اپنا تسلط چاہتا تھا اور بے یار و مددگار انیسہ بھی لامحالہ اُس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ چنانچہ اچھے دنوں کے انتظار میں انیسہ نے گھر کی قیمتی اور قابلِ فروخت چیزیں بازاروں کو بھجوانا شروع کر دیں، اب اتنے ساز و سامان کی ضرورت بھی کیا تھی۔ دونوں لڑکے اعلیٰ تعلیم کے لئے گھر تو کیا شہر چھوڑ کر بدیس جا چکے تھے اور لڑکیاں بھی تعلیمی مراحل طے کرنے کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ صرف ان کی شادیوں کا مسئلہ تھا جس کے لئے ابھی دن تھے۔ لہٰذا کچھ عرصہ پھر جھٹپٹوں کی طرح جلتا سلگتا کرتا ہر حصّوں پر اپنی چھپاتی روشنی پھینکتا آسودہ خاطری سے گزر گیا۔ اور بالآخر ایک رات نعیم یہ مژدہ لے کر آیا کہ کام بن گیا۔ جب پھر پیسے کی ریل پیل ہوگئی تو انیسہ بالکل نئی دلہن کی طرح مسکرائی۔ دولت

کے خاتمے کے ساتھ ہی زیادہ تر لوگ انیسہ سے کنارہ کشی اختیار کر چکے تھے۔ لہٰذا ہاتھ سے اُڑتے ہوئے تمام طوطوں چشموں کو بھول کر وہ نعیم کے گلے میں باہیں ڈالنے واقعی تیار ہو گئی کہ شباب گزرا۔ ایک عمر گزر گئی کم از کم اب تو وہ ساتھ ساتھ جی لیں۔

اور افراطِ عشرت سے سیراب رابعہ کی موت اور عائشہ کی کسی دُور دراز ممالک کو روانگی کے بعد نعیم نے بھی محسوس کیا کہ زندگی جیسی کچھ بھی سہی لیکن گھر پھر بھی ایک حقیقت کہ جہاں تھکا ماندہ وجود جب چاہے سکون کی سانسیں لے سکے۔ آرام پاتے تب دونوں ایک دوسرے کی خاطر بڑے چاؤ سے ہنس پڑے اور دونوں نے اپنی اپنی پچھلی زندگیوں اور رنگ رلیوں کو یاد نہ رکھنے کا اپنے اپنے طور پر تہیہ کر لیا۔

پیسہ آیا تو قرض ادا ہو گئے۔ فراغت پھر گھر میں آ گئی۔ نئے دوست احباب آئے۔ نئی محفلیں سجیں اور اِس بابت طرح طرح کی افواہیں بھی مشہور ہو گئیں۔ کسی نے کہا نعیم نے کہیں زبردست ڈاکہ ڈالا ہے۔ کوئی بولا۔ ان کے آبائی گھر سے کوئی مدفون خزانہ برآمد ہوا ہے۔ کسی نے بتایا نعیم بک گیا ہے مگر حقیقت چھپی رہی اور زندگی پھر تیز گامی سے گزرنے لگی مگر زندگی کے اِس دَور میں بظاہر مسرور اور پُر سکون ہوتے ہوئے بھی نعیم' انیسہ دل سے مطمئن نہ تھے۔ کوئی چیز کیل کانٹے کی طرح اندر ہی اندر دونوں کی ہستیوں میں دھنسنے، دونوں کو مضمحل اور مجروح کرنے لگی تھی۔ دونوں خوشی کے سوا کچھ اور نہ چاہتے تھے۔ مگر دونوں خوش نہیں تھے۔ دونوں اس احساس کو ایک دوسرے سے چھپانے کی کوشش بھی کر رہے تھے لہٰذا نعیم نے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ (تھیسس) لکھنا چاہا مگر نہ لکھ سکا اور انیسہ سماجی بھلائی کے کاموں میں ضرورت سے زیادہ مصروف ہو گئی مگر جو کچھ کر چکی تھی اُس سے زیادہ کچھ بھی نہ کر سکی۔

تھک ہار کر دونوں نے پھر ایک دوسرے کو دُکھڑا دل سُنایا اور یہ طے پایا کہ وہ کچھ عرصے کے لئے نقلِ مقام کر ڈالیں تاکہ زندہ رہنے کی قوت وطاقت دونوں میں دوبارہ

بحال ہو سکے، اور اندرونی استحکام دوبارہ حاصل ہو سکے۔ انجانا اضمحلال اور اوداسی اُن دونوں کا پیچھا چھوڑ سکے لہٰذا چٹ پٹ سامان سفر باندھا گیا اور دونوں ایک صحت افزا مقام پر اٹھ گئے۔

اب ان کے اطراف انسان کم قدرتی حسن زیادہ تھا۔ نرمی، خوبصورتی، وسعت، بے پناہی، گمبھیرتا ہی گمبھیرتا۔ مگر چند دنوں کے بعد یہی سب کچھ ان کا خوف بن گئے۔ وہ آئیڈیلز نہیں تھے مگر دنیا میں انہوں نے اپنے مقام کو بہت، بلند، برتر، باوقار سمجھا تھا سب پر خود کو ہمیشہ فوقیت دی تھی مگر اب انہیں علانیہ محسوس ہونے لگا کہ وہ بہت حقیر از کمتر ہیں۔ انہیں تازہ ہوا کی سی فرحت نہیں۔ سبز دوب کی سی نرمی نہیں۔ بہتے پانی کی سی ستھرائی نہیں۔ جھومتے درخت کی سی بے فکری نہیں۔ چڑھتے سورج جیسی روشنی نہیں، اُبھرتی دھوپ جیسی حرارت نہیں، سہانی شفق جیسی خوب صورتی نہیں۔ چمکتے ستاروں جیسی یگانگت نہیں۔ پُرشکوہ پہاڑوں جیسی شوکت نہیں۔ سنہرے چاند جیسی ضیاء نہیں۔ انہیں کوئی بھی اونچائی، سربلندی، گہرائی نہیں۔ وہ گوشت پوست کے فقط دو لوتھڑے ہیں جو خوبصورتی اور تنوع کے درمیان رہ کر بھی بدشکل اور محدود رہ گئے۔ اپنے ہی اختیار اپنے ہی زعم اپنی ہی ذات میں بند۔ جو ہر سورج کے ساتھ اٹھے، ہر چاند کے ساتھ مسکرائے، جنہوں نے بے شمار سانسیں لیں مگر کبھی بام رفعت تک نہ پہنچ پائے۔ چاندنی نہ بن سکے ایک سانس کا عطر بھی جن کے نفس کی شیشی میں کبھی موجود نہ رہا تو کیا وہ اُس گڈریے سے بھی گئے گزرے ٹھہرے جس نے بھیڑیں چرائیں، بانسری بجائی، زندگی میں شریک اور شامل رہا۔

اُس کوچوان سے بھی پیچھے جس نے سواریاں اِدھر سے اُدھر پہنچائیں اور اُنہیں اُن کے مقامات تک چھوڑا۔ اس آہن گر سے بھی رہے ہیے، جس نے لوہا کوٹا پیٹا اور استعمال کی کچھ نہ کچھ کارآمد چیزیں ضرور بنا ڈالیں۔ ہائے! یہ کیسا خوف کیسی شبک

سری تھی۔ جس نے انہیں گھیر لیا۔

کون جو بار بار اُبھر کر اُن کے اندر سے باہر آنا چاہتا تھا۔ مگر ہر بار دب جاتا، دفن ہو جاتا کہ اب باہر آ کر بھی حاصل ــــــ؟

دونوں زیادہ سے زیادہ بکواسی، زیادہ سے زیادہ بے معنی ہونے لگے۔

"سنو!" نعیم یکایک کہتا۔ "میں اپنا ایک مجسمہ بنواؤں گا اور ....

"چُپ رہو" انیسہ اُداسی سے کہتی۔ "مجسمہ بنوا کر کیا کرو گے۔ مجسمہ کچھ کہنے سے رہا۔"

"ہاں!" نعیم سوچتا۔ "مجسمہ واقعی بیکار ہے، خواہ مخواہ کی دردسری اور آفت تب؟" کیا اُسے پینٹنگ بنانی چاہیئے؟"

مگر انیسہ پینٹنگ کے خیال سے بھی متفق نہ ہوتی۔

"تم خود کو اتنا پینٹ کر چکے ہو کہ اب کچھ اور پینٹ نہیں کر سکتے۔ تمہیں اس بات سوچنا ہی نہیں چاہیئے"

"تو پھر میں کیا کروں؟ ــــ کیا ــــ؟"

"کچھ بھی کرو میرا سر نہ کھاؤ، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں ... تھا ..."

نعیم غور سے انیسہ کو دیکھتا اور وحشت زدہ ہو جاتا۔

"ہاں تم بھی ــــــ تم بھی تو ...."

انیسہ جھنجھلاتی ــــ "میں کہتی ہوں یہ پھٹا ڈھول بند کرو ــــ ہم کوئی ملزم مجرم نہیں"

ہا ہا ہا نعیم ہنستا ــــ "جرم و الزام خاصہ دلچسپ موضوع ہے۔ مگر میں اس پر کوئی کتاب نہیں لکھوں گا۔ ادیب بڑے بے وقوف ہوتے ہیں۔ پتہ کی سب باتیں سب کو بتا دیتے ہیں لیکن میں ایسا اناڑی نہیں"

پھر کچھ توقف سے وہ کہتا:

"اچھا، موسیقی کی بابت تمہارا کیا خیال ہے ؟"

انیسہ کراہنے لگتی : "چپ رہو، چپ رہو۔ کچھ بھی کرو مگر اب چپ ہو جاؤ"

اور وقت قطرہ قطرہ، آنسو آنسو بن جاتا۔ نعیم انیسہ کے پاس سے ہٹ جاتا اور سوچتا۔ بڑی پاجی عورت ہے۔ جب خود بولتی ہے تو میری نہیں سنتی۔ مگر جب خاموش رہتی ہے تب بھی کچھ کہنے نہیں دیتی۔

اور جب نعیم ہٹ جاتا تو انیسہ پھر تنہائی سے ہول کھانے لگتی۔ نعیم کیوں چلا گیا۔ نعیم کہاں چلا گیا۔

دونوں دونوں کی سمجھ میں نہ آیا یہ کیسی گھبراہٹ ہے یا کیسی بد مزگی ؟

وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھتے منتقل ہوتے رہے۔ اور ہر جگہ ابتداء میں انہیں پر سکون معلوم ہوئی مگر پھر بعد میں یکساں طور پر بھول اور مضطرب کر دینے والی۔

کیا تمام انسان تمام مقامات انہیں قبول کرنے کے نا قابل ہو گئے تھے یا وہ خود کسی کو قبول کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔

عجیب بے سروسامانی تھی جیسے اُن میں کچھ بھی نہ رہا ہو۔ اُن کا خالی پن اور اس خالی پن کا وزن ہی ہر جگہ ان کے ساتھ گھسٹتا پھر رہا ہو۔

انیسہ کچھ بیمار سی رہنے لگی۔ کیوں ہے ——— کیوں ؟ ایسی حالت کیوں۔ وہ رہ رہ کے سوچتی اور اُسے محسوس ہوتا یہ کوئی خوف ہے کوئی خطرہ۔

آنے والے یا گزرے ہوئے لمحات کا جو آہستہ آہستہ اسے جکڑ رہا ؛ پکڑ رہا۔ بے بس کر رہا ہے۔ جو اُس کی ذات میں بس گیا ہے۔ اُس کے سو جانے کے باوجود اُس کے اندر سدا جاگتا اور پوچھتا ہو۔ "تم کون ہو ؟ ۔ کون۔

اور وہ اس سوال کا جواب نہ پا کر ہمیشہ گھبرا جاتی۔ پورے اعتقاد سے کہنا چاہتی۔

میں ایک انسان ہوں، انسان۔ میں نے اچھائی کے لئے انسانوں کو صف
آرا، متحد کیا ہے۔ میں نے بے شمار پلیٹ فارموں سے زندگی کی اقدار کی بابت لوگوں
کو سوجھاؤ دیے ہیں۔ میں نے انسانیت اور سماج کی خدمت کی ہے مگر اس جواب
سے بھی اُس کا کرب کم نہ ہوتا۔ اُسے لگتا یہ جواب بالکل مہمل اور جھوٹا ہے۔ وہ انسان
نہیں بن سکی۔ کچھ بھی نہیں بن سکی۔ کچھ بننے کی کوشش میں صرف گھانس پھونس کا وہ گٹھر
بن گئی ہے جو ایک چھوٹی سی چنگاری سے بھی بھڑک کر بھسم ہو سکتا ہے۔ بالکل خاکستر
کہ اپنے اندر جینے بسنے کی کوشش کرنے کی بجائے وہ سدا باہری دنیا میں سانس
لیتی رہی۔ دوسروں میں آمیز ہو جانے کے لئے سدا خود سے فرار چاہتی رہی۔

فرار — جس سے کچھ بھی پایا نہیں جاسکتا۔

وہ ڈر کر تھر تھر کانپنے لگ جاتی۔ اُسے یقین ہونے لگتا کہ جس دن وہ اپنے
جلبے سے باہر قدم رکھے گی اُسی وقت ملیامیٹ ہو جائے گی کہ اپنی ذات کو اُس
نے کبھی بہترین پناہ گاہ نہیں سمجھا۔ ہمیشہ خود سے بچی رہی حالانکہ کسی کی ذات ہی،
اُس کا بہترین مسکن ہوتی ہے اور صرف کیڑے ہی بلوں کے اندھیرے میں بغیر
روشنی کے جی سکتے ہیں۔

تو کیا وہ بھی ایک حقیر کیڑا بن چکی ہے ؟

نہیں نہیں وہ بڑبڑاتی۔ ایسا نہیں۔ مگر اپنی زندگی کا کوئی جواز اُس
کی سمجھ میں نہ آتا اور وہ خوف زدہ، خوف زدہ سی بار بار دوڑ کر نعیم کے
پاس پہنچ جاتی۔

نعیم ڈر جاتا۔ "یہ کیا ہے انیسہ ؟ کیسا پاگل پن ہے ؟"

انیسہ اُسے گھورتی پھر پوچھتی۔

"کیا تمہیں بھی کسی سوال کی گونج سنائی دیتی ہے نعیم۔ ؟"

"کیسا سوال؟ کونسا سوال؟ کون کرتا ہے سوال؟"

"جانے کون؟" انیسہ کپکپانے لگتی۔ "مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے جیسے......"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر لوٹ جاتی اور بستر پر گر کر زار و قطار رونے لگتی۔

یہ کیسی بیماری ہے؟ کونسی بیماری؟ آنسوؤں کی یورش اور یلغار کی بیماری؟

اور اُس کی گھبراہٹ دیکھ دیکھ کر پھر نعیم بھی انجانے طور پر گھبرانے لگتا اُسے زندگی کی دھوپ اُترتی ہوئی محسوس ہوتی روشنی کا سحر ٹوٹتا محسوس ہوتا۔ ارادوں کے چاند پھیکے لگتے۔ ایک آواز اُس کے شعور یا لاشعور سے نہ جانے کدھر سے، کہاں سے اُبھر اُبھر کر اُس کے اندر و باہر بھی گونجنے لگتی۔ سوال کرنے لگتی۔ کون ہو تم؟ ۔۔ کون؟ ۔۔ نعیم اُسے یقین دلانا چاہتا۔

میں ایک تعلیم یافتہ شخص ہوں جس نے علم و اخلاق کی ترویج و ترقی میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔ تہذیب و تمدن کی بقا اور ارتقاء کے ہر ہر امکان کو پھیلایا بڑھایا ہے۔ نااہل، نارسا، ناپختہ ذہنوں کو علم کی روشنی سے بقعۂ نور اور حیات کی تربیت سے مالا مال کیا ہے۔ میں نے عقل کی خدمت کی ہے۔ زندگی کو اہم خراج ادا کیا ہے۔ میں نے .... میں نے ...

مگر اُس کے یقین کی آواز بھی نہ جانے کیوں لڑکھڑا جاتی، اُسے سہارا ہوا ہر ہر طاقتور ستون اور شہتیر بھی چیخ کر چرمرا کر جھولتا محسوس ہوتا اور وہ اس آواز سے اس گونج سے بچنا چاہتا اور بوکھلا کر انیسہ کے پاس بھاگتا۔

"انیسہ! انیسہ!" پھر شرمندہ ہو کر انیسہ سے کہتا:

"مجھے پریشان نہ کرو، یوں بیماروں کی طرح ہر وقت پلنگ پر کیوں پڑی رہتی ہو، اٹھو، گھومو، پھرو، کھاؤ پیو، لڑو جھگڑو۔ زندگی کو انجوائے

کرو۔ رونق کو بنائے رکھو۔ مجھے تمہاری خاموشی پسند نہیں۔ خاموشی سے وحشت ہوتی ہے" مگر خاموشی تلوار کی طرح برابر انیسہ کے وجود پر لٹکتی رہتی۔ اور نعیم خود کو سنبھال کر ہنستا۔

"مت گھبراؤ! مت گھبراؤ...تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے پاگل نہ بنو اپنے اطراف دیکھو دنیا میں آخر کس بات کی کمی ہے، اور اگر کہیں تمہارا دل نہیں بہلتا تو چلو ہم اپنے گھر لوٹ چلیں۔ شاید وہیں سکون ملے"

یوں دونوں سیر و سیاحت ترک کر کے پھر اپنے گھر لوٹ آئے۔ گھر جو درہم برہم تھا جس کے تمام افراد ایک دوسرے سے چھوٹ اور بچھڑ چکے تھے۔ جن کی بڑی بڑی تصویریں اب بھی گھر کے تمام کمروں میں آویزاں تھیں۔ مگر جو خود ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے سے قاصر تھے۔ انیسہ نے دھیان بٹانے کے لئے کوئی کام کرنا چاہا۔ مگر اُس سے کچھ بھی نہ ہو سکا۔ نعیم نے پھر اُس کا مضحکہ اُڑایا، اور بولا:

"دوسروں کو مت ڈھونڈا کرو۔ دوسروں میں انسان گم ہو جاتا ہے پگلی! خود کو پانے کے لئے ہمیشہ خود کو ہی پیش نظر رکھو"

مگر وہ خود کہاں تھا، جس کو ایک بنیاد مان کر جس پر انیسہ پورا ایک گھر تعمیر کر سکتی۔

"مجھے مت بھٹکاؤ اور مت بھٹکاؤ!!" انیسہ نے اُداسی سے کہا۔ اور خود کو بے حد کمزور محسوس کرنے لگی۔ وہ کمرہ کمرہ گھومتی پھری مگر سوائے سناٹے کے کہیں کچھ نہ تھا۔ اُس کی شخصیت کے تمام حصے بے آب تھے اور احساسات کا ایک ایک رخ نوکیلا۔ یادوں کے تند تھپیڑے اُسے مسمار کئے دے رہے تھے۔ اس کا جی چاہا اپنی موجودہ شخصیت تج کر پچھلا سب کچھ بھول کر ایک نیا

گھر بسائے۔ اپنے بچوں کو جمع کرے۔ انہیں از سرِ نو شیر خوارگی بخشے، بچپنا رفاقت اور بھرپور زندگی دے۔ محبت کی خالص فضاء میں وفا اور نیک نفسی کی تعلیم دے۔ زندگی کے اونچے مقامات تک پہنچنے کی راہیں استوار کرے۔

خود اپنے ماں باپ کی روحوں سے معافی مانگے۔ تمام بے دریغ لٹائی ہوئی دولت سمیٹ کر کسی اچھے کام میں صرف کر دے۔ رابعہ اور عائشہ کو کلیجے سے لگائے

نعیم سے کہے۔۔۔ مجھے نہ بدلو۔ میں جیسی پیدا ہوئی تھی ویسی ہی رہنے دو۔

مگر ہائے یہ خواہش جو صدہا آئینے اپنے سامنے رکھ کر بھی کسی ایک میں مکمل جلوہ گر نہیں تھی۔ بلکہ ہر جگہ ٹوٹی پھوٹی، ٹیڑھی میڑھی، ترچھی، اوٹ پٹانگ سی تھی۔

کیا وہ یہ سارے آئینے توڑ دے ـــــ؟

وہ گھومتے گھومتے رُک جاتی۔ کہیں جم کر کھڑی ہو جاتی۔ بے ساختہ پکارنا چاہتی

رابعہ! ـــــ عائشہ ـــــ!!

مگر رابعہ سے اُسے ڈر لگتا۔ عائشہ سے ہیبت ہوتی۔

رابعہ سے اُس نے کتنی ناانصافی کی۔

عائشہ سے کتنی زیادتی۔

خود اپنے بچوں کو دودھ کی بوندوں کی طرح سینے میں رکھ کر پھر اُس نے ہی بوندیں گرا دیں۔ طاقت نہ بننے دیں۔

امی کو بھول گئی ـــ

ابا کو دھوکہ دیئے ـــ

کسی سے بھی ٹوٹ کر نہ مل سکی ـــ

زندگی! زندگی تو ختم نہ ہو۔ تو پھر ایک بار مجھے مل جا ـــ

وہ دیوانوں کی طرح سارے گھر میں بھٹکتی، بڑبڑاتی ـــ

میں کیوں پیدا ہوئی تھی ــــ کیوں؟

اور نسیم پاس آ کر کہتا ــــ سمجھاتا ــــ "تم اچھی خاصی ہو انیسہ، خواہ مخواہ بھٹکا نہ کرو۔ ماضی کو اپنے ذہن سے جھٹک دو۔ ماضی ایک بند باب ہوتا ہے۔ اور انسان کا ہر نیا قدم زندگی کے نئے باب کی طرف گامزن ہونا چاہیئے۔ مجھے دیکھو میں نے بھی خونِ دل پیا ہے۔ میں نے بھی قتل کئے ہیں۔ مگر میں خونی اور قاتل نہیں ہوں۔ میں نے زندگی سے انتقام لیا ہے اور میں آخری لمحے تک یہ انتقام لینا چاہتا ہوں۔ میں مفاہمتوں سمجھوتوں کی نذر ہوا ہوں۔ اور ہونا چاہتا ہوں کہ زندگی ایک دھوکہ ہے۔ زندگی ایک خواب نہیں۔ زندگی حقیقت نہیں۔ حقیقت صرف وہی ہے جس سے میں واقف نہیں۔ جسے لاعلمی میں میں نے اپنی قوت اور استحکام دے دیا ہے۔ وہی اب میں واپس چھیننا چاہتا ہوں، تاکہ صرف اپنی قوت و طاقت کو یاد رکھوں باقی سب کچھ بھول جاؤں۔

دیکھو میں کتنا مضبوط ہوں۔ کس قدر اٹل ــــ

میں نے تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ ببلو کو فریب دیا۔ عائشہ کا قتل کیا۔ میں نے نہ جانے کتنی زندگیوں کو خانماں برباد کیا۔ اپنے نصب العین کو بھولا ــــ اپنے مقصد سے پہلوتی کی۔ مگر میں متاسف نہیں ہوں۔ کیا زندگی ایک تماشہ نہیں انیسہ؟

دنیا کیا ہے؟ کیا ایک مدرسہ، مکتب؟

یا ایک مندر ــــ؟ ایک مسجد ــــ؟

ایک کلیسا ــــ؟ ایک گردوارہ ــــ؟

دنیا کچھ نہیں بنگی۔ فنون کا گھر نہیں۔ لطف کا کاشانہ نہیں۔ راحتوں کا آشیانہ نہیں۔ دنیا ایک معلق ہے۔ ایک خلا، جس میں ہم سب گردش کرتے سیاروں کی طرح گھوم رہے ہیں۔ کسی وقت بھی ٹکرا کر پاش پاش نیست و نابود ہونے کے لئے۔ لہٰذا [illegible]نے کی بجائے تم اپنا لو انیسہ۔ سب فنا کر دو۔ کچھ باقی

نہ چھوڑو کہ ثابت و سالم چیزیں اپنی ایک قیمت رکھتی ہیں۔ جو تمام خریدار ادا نہیں کر سکتے۔
ایک حقیقت جو محروم انسان کی سمجھ میں نہیں آتی ورنہ رابعہ یوں نہ مرتی۔ عائشہ خون کے
آنسو نہ روتی۔ میں خود یوں زندگی سے نہ کھیلتا۔ شاید محبت کی باہوں میں باہیں ڈالے
ستاروں کی طرح مسکراتا، آفتاب کی طرح لو دیتا، مہتاب کی طرح منور ہوتا مگر سارے
پھول میرے دامن سے گر چکے ہیں۔ میں نے خود اپنے دامن میں کانٹے بھر لئے ہیں۔
کہ اپنے نیچے کھرچے، کٹے پھٹے جھتوں کا بدلہ لوں، میں بھی زندگی کو کانٹے پیش کروں
اور ہنسوں کہ صرف اسی ہنسی سے میرے دل کو تقویت، دماغ کو راحت، میری انا
کو تسکین پہنچتی ہے اب —

چلو تم بھی ہنسا کو احمق ہیں وہ لوگ جو صرف نازاں و فرحاں پھل پھول دیکھتے
ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ پھولوں کو رنگ روپ، حسن رعنائی، سطوت و ملامت کس
نے دی۔ پھلوں کو رس اور مٹھاس کس نے دی۔ اس کھردری پُر پیچ پائیدار جڑ نے نہیں؟
جو خود بدشکل، بدہیئت سہی، جس کا مٹی اور کیچڑ میں لت پت نظارہ شاق اور گراں سہی
مگر جو زمین کے سنگلاخ سینے میں پتھریلی اکاخت کے باوجود اپنی جدوجہد سے غافل
نہیں رہی۔ اپنی قدرتی تمنا۔ اپنی بے محابا آرزو میں مگن۔ کبھی داد نہیں بلکہ ہر تحسین
اور نظر سے اوجھل اپنا وظیفہ خاموشی سے انجام دیا کرتی ہے کہ جب تک جڑ اچھی اور
مضبوط نہ ہو تب تک کوئی پودا کوئی درخت اپنا مصرف پورا نہیں کر سکتا۔ مگر یہ تباہ کیا
ہم ایسی جڑیں بن سکتے ہیں؟

نہیں۔ ہم نے اپنا رنگ اپنا رس خود نچوڑا ہے۔ اپنے خد و خال خود بگاڑے
اپنے جذبے خود قتل کئے ہیں۔ پھر دوسروں کو رس اور مٹھاس۔ دوسروں کو خد و خال
دوسروں کو زندگی دے کر فائدہ ....

دنیا کو کچھ نہ دو بیگی۔ دنیا سے سب کچھ لے لو۔

ہماری زندگیاں۔ صحیح نہیں۔ ہمارے غم دُنیا کے نہیں پھر بھی انکا ماتم کرنے کی بجائے آؤ ہم ان کا جشن منائیں۔

ہاہاہا۔۔۔ میں نے بڑے بڑے ادیبوں کو پڑھا ہے۔

عظیم مفکروں سے اُن کے خیالات سے مل چکا ہوں۔

عمدہ سے عمدہ پینٹنگ دیکھی ہے۔

خوب صورت شعر سُنے ہیں۔

تہذیب کے باب الداخلے سے ایک کارواں کو گزارا ہے۔ اپنے ارمانوں میں چاند، سورج، ستاروں سے گزرا ہوں مگر کیا میں ایک حقیر ذرے کی طرح فقط زمین کا حصہ نہیں۔

میں ایک اچھا مقرر بھی ہوں مگر کیا ایک اچھا انسان بھی ہوں؟

نہیں!! میں جانتا ہوں میں کیوں اچھا نہیں۔ لیکن اب میں خود کو آواز دینا۔ اُبھارنا نہیں چاہتا۔ میں خود کو سنوارنا نہیں چاہتا۔ میں اسٹیج کا اداکار نہیں اور میں خوش ہوں۔ بہت خوش۔۔۔

وہ دیوانہ وار ہنسنے لگتا اور انیسہ خوفزدہ ہو جاتی۔

"بے وقوف مت بنو! خود کو سنبھالو، صرف سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل ضرورت عمل کی ہے۔ تم نے نہایت مہمل تقریر کی ہے۔ بس اب تقریر ختم کرو۔ مجھے آرام کرنے دو۔۔۔ آرام۔۔۔"

دہاں آرام۔۔۔ نعیم منہ لٹکائے واپس چلا جاتا۔

انیسہ نے بہت کوشش کی کہ اپنے ڈھنڈار وجود سے تمام ناپنوں ونچھوں کیڑوں مکوڑوں کو نکال کر، وہاں جھاڑ پونچھ کرے۔ صاف ستھرا فرش بچھا کے آرام کا سامان مہیا کرے، مگر گرنے اور اُٹھنے کے اس تمام عمل کے دوران

وہ ایک منٹ ــ کو نہ بھول سکی کہ اب وہ کسی لائق نہیں۔ اپنے عمق میں دفن ہو چکی ہے۔ وہ دکھ چاہے اب زندہ نہیں ہو سکتی۔

یوں آرام سے محروم سایوں، پرچھائیوں کی طرح نعیم انیسہ ایک دوسرے کے ارد گرد منڈلاتے رہتے۔ ایک دوسرے سے ہولاتے، پھر ایک دوسرے کے پاس پہنچ جاتے۔ بچیاں اُن کی تقریریں، ان کے غم، ان کے دلاسے نہیں جان پاتیں۔ مگر اپنے ماں باپ کو اس طرح دیکھ دیکھ کر مسکراتیں۔ ہنستیں ــ

"اب آپ دونوں بوڑھے ہو رہے ہیں۔ آپ کے حوصلوں کے آئینے ٹوٹ چکے ہیں۔ مگر آپ آئینوں کے سامنے سے ہٹتے کیوں نہیں۔

پیاری امّی ..... پیارے ابّا ..... اب آئینے ہمارے لئے چھوڑ دیجئے ــ"

اور اُن کی ہنسی سُن کر نعیم انیسہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے سایوں اپنی پرچھائیوں کو بھول جاتے۔ اپنی آواز، اپنے وجود، اپنی ہستیوں کی گونج سے دُور پہنچ جاتے۔ اپنی بچیوں کی ہنسی بنکر مستقبل کی طرف لپکنے لگتے۔ مگر نیند پھر بھی اُن کی آنکھوں میں نہ آتی۔

نیند جو اُن کی آنکھوں سے اُڑ چکی، غایب ہو چکی تھی۔ شیرازہ حیات بکھر رہا تھا۔ جسم کے صنم منہدم ہو رہے تھے۔ خیالات کی تمام جل پریاں اپنے پنکھ سمیٹے سمندر کے مدوجزر میں کھو چکی تھیں ــــ صرف ایک خلا تھا جو ٹوٹ رہا تھا ــــ اُنھیں

اُگل نہ رہا تھا۔ اُنھیں اپنے میں ہی چکرا گھما رہا تھا جیسے
ایک دائرہ جو اُن کے اطراف مقفل ہو چکا ہو۔ جس کی چابیاں
کہیں گم ہو کر رہ گئی ہوں۔

اب یہ چابیاں کون ڈھونڈے